بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۚ ۝۱

(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۲

کتاب کا اتارنا اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ اور ایک وقت مقرر کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ اور جو کافر ہیں جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے، اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ

کہہ، کیا تم نے دیکھا وہ جنہیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو، مجھے بتاؤ کون سی چیز انہوں نے زمین سے پیدا کی ہے یا

سورۃ الاحقاف

نام:

اس سورت کا نام اَلْاَحْقَافِ ہے اور اس میں 4 رکوع اور 35 آیتیں ہیں۔ الْاَحْقَافِ کے معنی ریت کے ٹیلے یا تودے ہیں اور غرض اس سورت کی انجام مخالفت کی طرف توجہ دلانا ہے جس کے لیے تیسرے رکوع میں قوم عاد کی مثال بیان کی ہے، جو بڑی زبردست قوم تھی۔ اور یوں بتایا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے حق سے روگردانی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کی زبردست طاقت کے سامنے سب طاقتیں ہیچ ہوجاتی ہیں۔ پہلے دو رکوعوں میں صداقت وحی کا ذکر ہے اور پچھلے دو میں وحی کی مخالفت کے انجام کا۔

شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴

ان کی آسمانوں میں شراکت ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کوئی کتاب لے آؤ یا علم کا کوئی نشان (لاؤ) اگر تم سچے ہو۔ (3054)

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوائے اسے پکارتا ہے، جو قیامت کے دن تک اسے جواب نہیں دے سکتا اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔

وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۶

اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا انکار کرنے والے ہوں گے۔ (3055)

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ؕ

اور جب ان پر ہماری کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو کافر ہیں حق کے متعلق کہتے ہیں جب وہ ان کے پاس آچکا، یہ کھلا جادو ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸

بلکہ کہتے ہیں اس نے جھوٹ بنالیا ہے۔ کہہ، اگر میں نے یہ جھوٹ بنایا ہے تو تم میرے لیے اللہ کے مقابل پر کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے۔ جن باتوں میں تم لگے رہتے ہو وہ انہیں خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ بس ہے اور وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

3054- ﴿اَثٰرَةٍ﴾ اَثَرٌ کسی چیز کا بقیہ ہے اور اس کی جمع اٰثَارٌ ہے اور یہاں ﴿اَثٰرَةٍ﴾ ہے جس کے معنی زجاج نے علامت کیے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس کے معنی بقیہ علم ہوں یا علم کی بات جو لکھی جائے۔ (ل) [دیکھو نمبر: 1583]

3055- ظاہر ہے کہ یہاں انہی معبودوں کا ذکر ہے جو انسانوں میں سے بنا لیے گئے ہیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝	کہہ، میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ کہ) تمہارے ساتھ (کیا کیا جائے گا)(3056) میں اسی پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ع 1/10/1	کہہ، کیا تم دیکھتے ہو اگر یہ اللہ کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کرتے ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اپنے مثیل (کے آنے) کی گواہی دی تھی۔ سو اس نے مانا اور تم تکبر کرتے ہو۔ اللہ ظالم لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔(3057)

3056- ﴿بِدْعًا﴾ بَدِيْعٌ اور بِدْعٌ کسی چیز کا اس کے پہلے کو کہتے ہیں۔ اور ﴿مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ سے مراد ہے کہ میں پہلا رسول نہیں ہوں جو بھیجا گیا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی رسول آ چکے ہیں۔ (ل) اور بِدْعٌ کے معنی مُبْدَعٌ بھی ہو سکتے ہیں یعنی جس سے پہلے کوئی نہ آیا ہو اور مُبْدِعٌ یعنی بدعت کے طور پر کچھ کہنے والا۔ (غ)

﴿مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ﴾ حسن سے روایت ہے کہ اس سے مراد آخرت نہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ مجھے علم نہیں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا مجھ سے یا تم سے کیا معاملہ ہوگا، بلکہ دنیا کا معاملہ مراد ہے۔ یعنی آیا میں بھی نکالا جاؤں گا جس طرح مجھ سے پہلے نبی نکالے گئے یا قتل کیا جاؤں گا جس طرح مجھ سے پہلے نبی قتل کیے گئے۔ (ج) اور سیاق عبارت اسی کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ یعنی جس طرح پہلے رسول عالم الغیب نہ تھے میں بھی نہیں، نہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ کیا معاملہ کرو گے اور نہ یہ کہ اللہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ یعنی معاف کر دے گا یا سزا دے گا یا کتنی سزا دے گا۔ مگر یہاں علم نہ ہونے سے مراد تفصیلات کا علم نہ ہونا ہے اور ﴿نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ میں کہہ کر بتا دیا کہ تم بدی کے نتائج کو ضرور بھگتو گے۔

3057- **حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے:** یہ شاہد کون ہیں؟ جمہور مفسرین نے اسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہا ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ مسروق سے روایت ہے کہ یہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہیں، کیونکہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مدینہ میں اسلام لائے۔۔۔۔ آپ نے فرمایا کہ توریت قرآن کی مثل ہے اور موسیٰ علیہ السلام مثیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ شاہد موسیٰ ہیں۔ (ج) اور یہاں فی الحقیقت اشارہ اس موسیٰ کی مثل نبی والی پیشگوئی کی طرف

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴿۱۱﴾

اور جو کافر ہیں وہ ان کے بارے میں جو مومن ہیں کہتے ہیں اگر یہ بہتر ہوتا تو وہ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔ اور چونکہ وہ اس سے ہدایت یاب نہ ہوئے تو کہیں گے یہ پرانا جھوٹ ہے۔ (3058)

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲﴾ۚ

اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب راہ نما اور رحمت (تھی) اور یہ کتاب (اسے) سچ کر دکھانے والی ہے عربی زبان (میں) تاکہ وہ انہیں ڈرائے جو ظالم ہیں اور نیکی کرنے والوں کے لیے خوش خبری ہے۔ (3059)

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ۚ

وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے پھر سیدھی راہ پر جمے رہتے ہیں، تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (3060)

ہے جو [استثناء: 18:15-18] میں پائی جاتی ہے ''میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔'' تو اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلا کر کفار پر اتمام حجت کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ افتراء نہیں ہوسکتا، جیسا تم کہتے ہو۔ کیونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق ہے۔ اگلے رکوع میں اس مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے۔

3058- ﴿لَوْ كَانَ خَيْرًا﴾ یعنی قرآن کوئی اچھی چیز ہوتی تو یہ غربا اور ضعفا جیسے بعض غلام اور لونڈیاں تھیں ہم سے جو بڑے بڑے لوگ ہیں سبقت نہ لے جاتے۔ ﴿اِفْكٌ قَدِيْمٌ﴾ کہنے سے یہ منشا ہے کہ پہلے بھی لوگ اسی طرح جھوٹ بناتے رہے ہیں۔

3059- ﴿قَبْلِهٖ﴾ میں ضمیر قرآن کی طرف ہے اور ﴿اِمَامًا وَّ رَحْمَةً﴾ اسی سے حال ہے اور بعض کے نزدیک یہ کتاب سے حال ہے۔ صورت اول میں امام اور رحمۃ قرآن کریم کو کہا ہے اور صورت ثانی میں توریت کو بنی اسرائیل کے لیے امام اور رحمت بیان فرمایا ہے۔ اور وہ اس لحاظ سے بھی امام اور رحمت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی اس میں بالتصریح موجود ہے۔ اور یہاں بالخصوص اسی کی طرف اشارہ بھی ہے۔ کیونکہ آگے قرآن کریم کو مصدق کہا ہے اور ﴿لِّسَانًا عَرَبِيًّا﴾ میں اشارہ وضاحت بیان کی طرف بھی ہے اور پیشگوئی کی طرف بھی، جس کی رو سے بنی اسماعیل یا عرب میں سے نبی کا آنا ضروری تھا۔ [دیکھو نمبر: 1516]

3060- ایمان کی رو سے توحید پر قائم ہیں۔ اور منتہائے عمل استقامت ہے۔ استقامۃ کے لیے [دیکھو نمبر: 1509]

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

یہی جنت والے ہیں، اسی میں رہیں گے۔ یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا اور اس کا حمل میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے (تک) ہے یہاں تک کہ جب اپنی قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کو پہنچتا ہے کہتا ہے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو دی اور کہ میں نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میرے لیے میری اولاد کی اصلاح کر، میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ (3061)

3061- حمل اور فصال یعنی دودھ چھڑانے کی کل مدت تیس ماہ ہے اور دودھ پلانے کا زمانہ دو سال ہے۔ ﴿وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ [البقرة: 233:2] ''اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔'' باقی چھ ماہ حمل کے رہ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ بھی دی گئی ہے کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے۔ لیکن اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں حمل میں مشقت کا ذکر ہے اور مشقت کا رنگ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب بچے کا بوجھ پیٹ میں محسوس ہو اور یہ چوتھے مہینے میں ہی ہوتا ہے۔

انبیاء کی عمر بوقت بعثت:

﴿بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ ﴿اَشُدَّهٗ﴾ اور ﴿اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ کو بعض نے الگ الگ لیا ہے یعنی ایک سے مراد بلوغ جسمانی یا وہ بلوغ جو قوائے جسمانی کے کمال نشوونما سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے سے بلوغ روحانی یعنی وہ بلوغ جو اخلاق کے کمال نشوونما سے تعلق رکھتا ہے اور بعض نے ایک ہی۔ اَشُدَّ کے لیے [دیکھو نمبر: 1529] اور بلوغ روحانی چالیس سال پر ہی ہے اور اسی عمر میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوتی ہے اور یہ سب انبیاء کے متعلق مسلم ہے۔ سوائے اس کے کہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

یہی وہ ہیں جن سے ہم ان کے بہترین عمل قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ جنت والوں میں (شامل کر کے) سچا وعدہ ہے، جو انہیں دیا جاتا ہے۔(3061ل)

وَ الَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَ هُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور وہ جو اپنے ماں باپ کو کہتا ہے تف ہے تم پر، کیا تم مجھے ڈراتے ہو کہ میں نکال کھڑا کیا جاؤں گا اور مجھ سے پہلے (بہتیری) نسلیں گزر چکیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (ہوئے کہتے) ہیں، تجھ پر افسوس ایمان لا، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ تو وہ کہتا ہے یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

یہی وہ ہیں جن پر بات صادق آئی، ان گروہوں میں سے جو جنوں اور انسانوں سے ان سے پہلے گزر چکے۔ وہ نقصان اٹھانے والے تھے۔

علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں کو بچپن میں نبوت عطا ہوئی۔ مگر بچپن میں نبوت کا ملنا بے معنی ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ﴿اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ﴾ [مریم: 30:19] ''اس نے مجھے کتاب دی۔'' اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق ﴿وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ [مریم: 12:19] ''اور ہم نے اسے لڑکپن کی حالت میں فہم دیا۔'' کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ یہ اس بات کی خبر ہے جو ابھی واقع ہونے والی تھی۔ (ر) اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت 30 سال کی عمر میں مانی ہے۔ مگر یہ لوگ تاریخ کے بہت کچے ہیں۔ خود اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ جو پیدائش مسیح کا سال اناجیل میں دیا گیا ہے اس سے پانچ چھ سال پہلے آپ کی پیدائش ہوئی۔ بعثت انبیاء چالیس سال پر ہی صحیح ہے اور آیت کا مضمون عام ہے۔

3061ل- ﴿نَتَجَاوَزُ﴾ [جَوْزُ الطَّرِيْقِ] رستے کا وسط ہے اور جَاوَزَ اس کے جوز سے آگے نکل گیا۔ ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ﴾ [البقرۃ: 249:2] ''پس جب وہ اس سے گزر گیا۔'' (غ)

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ہر ایک کے لیے اس کے مطابق درجے ہیں جو انہوں نے عمل کیے اور تا کہ ان کے اعمال (کے اجر) وہ انہیں پورے پورے دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع 2 10 2

اور جس دن کافر آگ پر پیش کیے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزوں کو دنیا کی زندگی میں لے چلے اور اس سے چند روزہ فائدہ اٹھالیا۔ سو آج تمہیں ذلت کا عذاب بدلے میں دیا جائے گا، اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس لیے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔ (3062)

3062- ﴿طَيِّبٰتِ﴾ سے اذہاب یا لے جانے سے مراد عموماً یہ لی گئی ہے کہ اچھے اچھے سامانوں یا لذات کو تم نے دنیا کی زندگی میں پورا پورا لے لیا۔ اور آخرت کے لیے کوئی حصہ ان کا باقی نہ چھوڑا۔ اور گو یہ سچ ہے کہ لذات دنیوی میں انہماک انسان کے لیے حصہ آخرت کو باقی نہیں رہنے دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ صلحاء کی زندگی میں نمونہ یہی پایا جاتا ہے کہ وہ دنیوی لذات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور سادہ غذا، سادہ لباس، سادہ مکان پر ہی گزارہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ بالخصوص اس زمانہ میں جب چاروں طرف لذات دنیوی کے لیے ایک جنون سا لوگوں کی طبائع پر غالب آ گیا ہے، صلحاء کی **سادہ زندگی کی طرف رجوع کرنا اصلاح کی سب سے پہلی ضرورت ہے**۔ اور تعجب تو اس قوم پر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بناتی ہوئی اور ان کی زندگی میں ایک کراس اور مصیبت کی برداشت کا ہی سب سے بڑا سبق بتاتی ہوئی خود ہر طرح کی لذات اور عیش و آرام کے سامانوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ لیکن یہاں طیبات کے اذہاب یا ضائع کرنے سے مراد ان قویٰ کا ضائع کر دینا جو انسان کے لیے طیبات کو بطور نتیجہ پیدا کرتے ہیں، زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں اذہاب اور اِسْتِمْتَاعٌ دو الگ الگ فعل ہیں اور لذات دنیوی میں پڑ جانا اِسْتِمْتَاعٌ کا مفہوم ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان چند روزہ فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو طیبات سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیتا ہے اور اسی محرومی کی طرف ہی اذہاب طیبات میں اشارہ ہے۔ اِسْتِمْتَاعٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 637] دنیا کی زندگی کتنی بھی لمبی ہو، بمقابلہ آخرت کے چند روزہ ہے۔

وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾

عاد کے بھائی (ہود) کا ذکر کر، جب اس نے اپنی قوم احقاف کو ڈرایا۔ اور ڈرانے والے اس سے پہلے بھی آئے اور اس کے پیچھے بھی کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب (کے آنے) سے ڈرتا ہوں۔ (3063)

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾

انہوں نے کہا، کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اپنے معبودوں سے پھیر دے۔ سو لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اگر تو سچا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس نے کہا، (اس کا) علم تو صرف اللہ کو ہی ہے اور میں تمہیں وہی پہنچاتا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے، لیکن میں ایسے لوگ دیکھتا ہوں جو جہالت کرتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ﴿۲۴﴾

پھر جب اسے ایک بادل (کے رنگ میں) دیکھا جو ان کی وادیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، کہنے لگے یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے۔ ہَوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔ (3064)

3063 - ﴿بِالْاَحْقَافِ﴾ حِقْف کی جمع ہے تو وہ ریگ یا ریت جو مستطیل شکل میں اونچی ہوگئی ہو۔ (ل) جس میں ٹیڑھا پن پیدا ہوجائے اور یہ علاقہ یمن میں عمان اور حضرموت کے درمیان ہے جہاں قوم عاد کے لوگ رہتے تھے۔ اور پہلے پیچھے ڈرانے والوں کے آنے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عام قانون ارسال رسل کی طرف توجہ دلائی ہے یا یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ خاص اس قوم میں ہود سے پہلے بھی رسول آئے اور پیچھے بھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا کچھ بقایا رہ بھی گیا تھا۔

3064 - ﴿عَارِضٌ﴾ وہ چیز جو اپنے عرض یعنی فراخی کو ظاہر کرے۔ بعض وقت بادلوں پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں۔ اور بعض وقت اس پر

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرتی ہے۔ سو وہ ایسے ہو گئے کہ سوائے ان کے مکانوں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح ہم مجرم قوم کو بدلہ دیتے ہیں۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع 3 6 3

اور یقیناً ہم نے انہیں ایسی باتوں میں قدرت دی تھی جن میں تم کو بھی قدرت نہیں دی۔ اور انہیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تھے۔ سو نہ ان کے کان اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کسی کام آئے، جب کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ اور انہیں اس نے آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے تمہارے آس پاس کی کئی بستیاں ہلاک کر دیں اور ہم آیتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ رجوع کریں۔ (3065)

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ

تو انہوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنہیں انہوں نے قرب

جو بیماری سے سامنے آجائے اور بعض وقت رخسار پر۔ (غ)

﴿مُسْتَقْبِلَ﴾ اِقْبَالٌ اور اِسْتِقْبَالٌ کے ایک ہی معنی ہیں، سامنے کی طرف متوجہ ہونا۔ (غ)

3065 - ﴿مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى﴾ میں عرب کے کنارے کی سب بستیاں آجاتی ہیں جن کی ہلاکت کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وسعت اس کے معنی میں ہے۔ اور تمام دنیا کی بستیاں جہاں ہلاکت آئی ہو شامل ہو سکتی ہیں۔ اور جو بعض **مضامین کو قرآن شریف میں بار بار بیان فرمایا ہے** تو اس کی غرض بھی یہاں خود ہی بتادی تاکہ لوگ رجوع کریں۔ انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے اور دنیوی اشغال میں اس کا انہماک اس قدر ہے کہ جس طرح گہری نیند سوئے ہوئے کو جگانے کے لیے ایک دفعہ ہلانا کافی نہیں ہوتا، بلکہ بار بار ہلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح غافل لوگوں کی تنبیہ کے لیے بار بار ایک بات کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اور نیکیوں کے لیے بھی یہ بار بار کا دہرانا رجوع الی اللہ میں ترقی کا موجب ہوتا ہے۔

اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوائے معبود بنایا تھا، بلکہ وہ ان سے غائب ہو گئے۔ اور یہ ان کا جھوٹ اور افتراء کی ہوئی باتیں تھیں۔

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَ لَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور جب ہم جنوں کا ایک گروہ تیری طرف لے آئے کہ وہ قرآن کو سنیں۔ سو جب اس پر حاضر ہوئے کہنے لگے چپ رہو۔ سو جب تمام ہوا اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس ہوئے۔ (3066)

3066- **جنوں کے وفد کے متعلق روایات مختلف:** ﴿اَنْصِتُوْا﴾ نَصَتَ اور اَنْصَتَ کے معنی ہیں چپ رہا اور بات کو سنا۔ (ل) جنوں کے اس گروہ کے متعلق ذیل کی باتیں روایات میں ملتی ہیں جو تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں۔

① مسند احمد کی روایت میں زبیر سے مروی ہے کہ یہ نخلہ میں تھا اور رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے اور وہ (بوجہ کثرت تعداد) ٹوٹے پڑتے تھے۔

② سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر میں روایت ہے کہ وہ سات تھے اور نصیبین کے رہنے والے تھے۔ اور بیہقی میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں پر قرآن نہیں پڑھا نہ انہیں دیکھا۔ آپ اپنے صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ سوق عکاظ کا قصد کرتے ہوئے گئے۔ ادھر شیطانوں کو آسمان کی خبر ملنی رک گئی اور ان پر شہاب پھینکے جانے لگے، تو شیاطین لوٹ کر اپنی قوم کی طرف آئے اور کہا کہ آسمان کی خبر ملنی رک گئی ہے۔ پس وہ چاروں طرف پھیل گئے کہ ساوی خبروں کے رک جانے کی وجہ معلوم کریں۔ اور جو گروہ تہامہ کی طرف آیا تھا انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کے ساتھ نخلہ میں نماز فجر پڑھتے پایا اور جب قرآن کو سنا تو کہا کہ یہی ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبر ہم تک پہنچنی رک گئی ہیں۔ پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور کہا [يٰقَوْمَنَآ سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ. قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: (لِبَدًا) أَعْوَانًا: 4921) اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی پر اتارا ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ [الجن: 72:1] ''کہہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے سنا'' اور یہ بخاری اور مسلم نے بھی روایت کی ہے اور امام احمد نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت کی ہے کہ جنّ وحی کو سن لیا کرتے تھے اور ایک بات کے ساتھ دس جھوٹ ملا کر آگے مشتہر کیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو ان پر انگارے پڑنے لگے۔ تو اس کی شکایت انہوں نے ابلیس سے کی،

تب وہ مختلف اطراف میں اس بات کی تلاش میں نکلے۔اور حسن بصری نے بھی یہی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے متعلق کوئی علم نہیں ہوا جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی آپ پر نہیں اتاری۔

③ محمد بن اسحاق نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ طائف تشریف لے گئے تو وہاں سے واپسی پر نخلہ میں رات رہے اور وہاں جنوں نے آپ سے قرآن سنا اور یہ نصیبین کے رہنے والے تھے۔

④ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام احمد نے روایت کی ہے کہ ہم نے مکہ میں ایک رات رسول اللہ ﷺ کو نہ پایا اور ہمیں سخت فکر دامنگیر رہا، یہاں تک کہ صبح ہوئی تو آپ غار حرا کی طرف سے واپس آئے اور فرمایا کہ مجھے جنوں کا بلانے والا بلا کر لے گیا تھا۔سو میں ان کے پاس گیا اور انہیں قرآن پڑھ کر سنایا۔پھر آپ ہمارے ساتھ گئے یہاں تک کہ ہمیں ان کے نشان اور ان کی آگ جلانے کے نشان دکھائے۔اور کسی روایت میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں ہے کہ اس رات رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کے پاس جائے گا۔تو میرے سوائے اور کوئی آپ کے ساتھ نہ گیا۔پھر جب ہم مکہ کی اوپر کی زمین پر پہنچ گئے تو آپ نے میرے لیے ایک نشان لگا دیا اور میں وہاں ٹھہرا رہا اور آپ آگے چلے گئے اور قرآن شریف پڑھنا شروع کیا اور ایک سواد کثیر میرے اور آپ کے درمیان حائل ہو گیا، یہاں تک کہ میں آپ کی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔اور بیہقی کی ایک روایت میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور فرمایا کہ جنوں کی ایک جماعت پندرہ کس کی بنی اخوہ اور بنی عمہ سے میرے پاس آج آنے والی ہے۔اور عکرمہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ جزیرہ موصل کے بارہ ہزار جن تھے اور قتادہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ نینوا سے آئے تھے۔اور عبدالعزیز بن عمر سے ایک روایت ہے کہ جو جن آپ کو نخلہ میں ملے وہ نینوا سے تھے اور جو مکہ میں ملے وہ نصیبین سے تھے۔اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ سات کس اہل نصیبین میں سے تھے۔پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف رسول بنایا اور مجاہد کی روایت میں ہے کہ یہ سات تھے جن میں سے تین اہل حران میں سے تھے اور چار نصیبین سے۔اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ لفظ بھی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ وہاں سے واپس آئے اور نماز پڑھنے لگے تو ان میں سے بھی دو شخص آئے اور انہوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔تو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! یہ کون تھے؟ تو آپ نے فرمایا نصیبین کے جنّ۔

جنّ غیر مرئی ہستیاں نہ تھیں:

اس اختلاف روایات میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کو ایسی غیر مرئی ہستیاں قرار دیتے ہیں جو شیاطین کہلاتی ہیں اور اس واقعہ کو ابتدائے نبوت کا واقعہ بتاتے ہیں، حالانکہ یہ سورتیں بہت بعد کی ہیں۔پس یہ خیال قابل قبول نہیں۔اور جہاں تک شیاطین کے استماع وحی کا سوال ہے اس پر میں مفصل بحث [نمبر: 1679] میں کر چکا ہوں۔اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مقابل پر زیادہ قابل اعتماد سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات ہیں، کیونکہ وہ اس واقعہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہونا بیان کرتے ہیں۔اور ان سب روایات میں جو قدر مشترک کے طور پر بات ہے وہی لی جا سکتی ہے اور وہ صرف اسی قدر ہے کہ یہ ایک نفر یا چند آدمیوں کی

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾

کہا اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی، اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہے۔ وہ حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ (3067)

جماعت تھی اور رسول اللہ ﷺ کو ان کے آنے کا علم تھا۔ مگر آپ تنہائی میں اور رات کے وقت ان سے ملے اور قرآن شریف انہیں پڑھ کر سنایا۔ اور جہاں وہ رات رہے ہیں وہاں ان کے نشان اور ان کی آگ جلانے کے نشان بھی ان کے چلے جانے کے بعد باقی تھے اور یہ باہر سے آئے تھے اور یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ لفظ جنّ پر مفصل بحث [نمبر: 1015] میں گزر چکی ہے، جہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ انسانوں پر بھی بولا جاتا تھا اور غیر مرئی ہستیوں پر بھی۔ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو باتیں ان کے متعلق بیان کی ہیں وہ صاف بتاتی ہیں کہ یہ غیر مرئی ہستیاں نہ تھیں، وہ کہیں باہر سے آئے تھے یعنی اجنبی لوگ تھے۔ شاید اسی وجہ سے انہیں جن کہا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ان سے مکہ سے باہر جا کر تنہائی میں ملاقات کرنا اسی کا مؤید ہے۔ اگر غیر مرئی ہستیاں ہوتیں تو مکہ میں کون امر مانع تھا۔ علیحدگی اور تنہائی کی ضرورت اسی لیے پیش آئی کہ کفار تکلیف نہ دیں۔ پھر ان کے اپنے نشان اور ان کے آگ جلانے کے نشان بھی ان کے چلے جانے کے بعد موجود تھے۔ آگ جلانے کی ضرورت کھانا وغیرہ پکانے کے لیے انسانوں کو ہوتی ہے اور نشان بھی انسانوں کے باقی رہ سکتے ہیں نہ غیر مرئی ہستیوں کے۔ پھر بعض ان میں سے آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز بھی پڑھتے ہیں، شاید یہ ایسے ہوں جو فوراً ایمان لے آئے ہوں اور باقی ابھی تردد میں ہوں اور انہیں اہل نصیبین یا اہل موصل یا اہل نینوا قرار دینا بھی صاف بتاتا ہے کہ وہ انسان ہی تھے۔ ورنہ جنوں کی کوئی خاص بستیاں نصیبین یا موصل میں نہیں ہیں۔ وہ تو غیر مرئی ہستیاں ہیں انہیں بستیاں بنا کر رہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور غالباً یہ نصیبین کے یہودی تھے جیسا کہ ﴿اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ سے ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں جن ان احکام کے مکلف بھی نہیں ہو سکتے جو انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وہ علیحدہ ہستیاں ہیں اور قرآن شریف میں جس قدر احکام ہیں وہ انسانوں کے لیے ہیں جنوں کے لیے ضروری نہیں۔ اگر ان پر بھی اسی طرح قرآن شریف پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے جس طرح انسانوں کے لیے ضروری ہے تو کچھ نہ کچھ تفصیلی احکام ضرور ان کے متعلق ہوتے۔ رہا انسانوں کے جنوں کو دیکھنے کا سوال سو وہ اسی رنگ میں دیکھے جا سکتے ہیں جس طرح ملائکہ اور وہ اس قسم کی ہستیاں ہیں کیونکہ وہ نار سے پیدا ہوئے تو ملائکہ نور سے۔ پس جہاں تک ان کے شکل وصورت کے اختیار کرنے، مکلف باحکام ہونے، کھانے پینے وغیرہ کا معاملہ ہے انہیں مشابہت ملائکہ سے ہے نہ انسانوں سے۔

3067 - ﴿كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ حالانکہ بنی اسرائیل میں موسیٰ کے بعد بہت سے نبی آ چکے تھے لیکن چونکہ تفصیلی شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی نبی پر نازل نہ ہوئی تھی اور وہ مثیل کی پیشگوئی بھی تھی جس کی طرف قرآن شریف نے بار بار توجہ دلائی تھی

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے قصور تمہیں معاف کر دے اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے۔

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

اور جو کوئی اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول نہ کرے گا، تو وہ زمین میں (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والا نہیں۔ اور اس کے لیے اس کے سوائے کوئی مددگار نہیں ہوں گے، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے۔ ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (3068)

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور جس دن وہ جو کافر ہیں آگ پر پیش ہوں گے کیا یہ سچ نہیں؟ کہیں گے ہاں، ہمارے رب کی قسم۔ کہے گا، پس عذاب چکھو۔ اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔

کتاب موسیٰ میں ہی تھی، اس لیے اسی کا ذکر کیا۔

3068 - ﴿يَعْيَ﴾ اِعْيَاءٌ وہ عاجزی ہے جو بدن کو چلنے سے پہنچتی ہے اور عِیٌّ وہ عاجزی ہے جو کسی امر کا متولی ہونے اور کلام سے پہنچتی ہے۔ ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ [قٓ: 15:50] ''تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے؟'' (غ) اس بیان میں کہ اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو پیدا کر کے تھکا نہیں بائبل کے اس بیان کی غلطی کو ظاہر کیا ہے کہ اس نے چھ دن میں زمین و آسمان بنا کر ساتویں دن آرام کیا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع 4/9/4

سو صبر کر، جس طرح اولوا العزم رسول صبر کرتے رہے اور ان کے لیے جلدی نہ کر۔ جس دن وہ اسے دیکھیں گے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے، گویا دن کی ایک گھڑی ہی ٹھہرے تھے، (یہ) پہنچا دینا ہے۔ تو کیا سوائے نافرمان لوگوں کے کوئی اور بھی ہلاک کیا جائے گا۔ (3069)

3069- ﴿اُولُوا الْعَزْمِ﴾ عَزْمٌ دل کا کسی کام کے کر لینے پر مضبوط ہو جانا ہے اور ﴿اُولُوا الْعَزْمِ﴾ سے مراد وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے امر پر عزم کر لیا۔ اس میں جو اس نے انہیں حکم دیا اور تفسیر میں ہے کہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اولوا العزم رسول ہیں اور آنحضرت ﷺ بھی ان میں سے ہیں۔ (ل) اور بعض نے اور نام بھی لیے ہیں، مگر ابن زید کا قول جو ابن جریر میں منقول ہے صحیح ہے [كُلُّ الرُّسُلُ كَانُوْا اُوْلِي عَزْمٍ] سب رسول ہی اولوا العزم تھے۔

﴿بَلٰغٌ﴾ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں [ذٰلِكَ بَلَاغَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا اِلٰى اَجْلِهِمْ] یعنی یہی ان کا ٹھہرنا دنیا میں ان کی اجل تک ان کا پہنچا دینا تھا اور دوسرے یہ کہ قرآن ان کے لیے بلاغ ہے یعنی بات کو کمال کو پہنچا دیتا ہے اگر وہ غور و فکر سے کام لیں۔ (ج)

سورۃ محمد

نام:

اس سورت کا نام مُحَمَّدٍ ہے اور دوسرا نام قتال بھی ہے۔ اور اس میں 4 رکوع اور 38 آیتیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک محمد اس سورت کی دوسری آیت میں آتا ہے جہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو محمد ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس نام میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کے نام لیوا دنیا میں ذلیل وخوار نہیں رہ سکتے (اور اسی مضمون کو صراحت سے اس سورت میں بیان کیا ہے) اس لیے کہ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا گیا۔ گویا اس سورت کا نام یہ رکھ کر اور دوسری طرف دونوں فریق کا جو آپ پر ایمان لاتے تھے اور جو آپ کی مخالفت کرتے تھے، ذکر کر کے یہ سمجھایا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی کسمپرسی کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ضرور ہے کہ آپ کا جلال دنیا میں ظاہر ہو۔

خلاصہ مضمون:

پہلے رکوع میں یہ بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے گو اس وقت گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور دشمن اپنی مخالفت میں کامیاب نظر آتا ہے، مگر یہ حالت نہ رہے گی۔ مسلمانوں کی تکلیفیں دور کی جائیں گی اور مخالفین کی مخالفت آخر ناکام ہوگی۔ اور یہیں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ جنگوں کے ذریعے سے ہوگا جن کے لیے مخالف تیار ہو کر نکل چکے ہیں۔ لیکن مسلمان ان پر غالب آئیں گے اور ان میں سے قیدی بھی بنائیں گے جنہیں فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر چھوڑ دینے کا حکم یہاں دیا گیا ہے۔ دوسرے رکوع میں اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان اہل مکہ سے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو نکالا ہے، زیادہ زبردست قوموں کو بھی ہم حق کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک کر چکے ہیں اور ان کی تباہی کی گھڑی بھی قریب آ رہی ہے۔ پچھلے دونوں رکوعوں میں منافقین کا ذکر کیا ہے جو جنگ سے ڈرتے تھے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے تھے۔

تعلق:

حٰمٓ کی ساری سورتیں عام طور پر حق اور باطل کے مقابلہ کا ذکر کرتی ہیں اس لیے ان کے بعد ایسی سورت کو لایا گیا جس میں یہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ اس وحی پر ایمان لانے والے کس طرح کامیاب ہوں گے اور ان کے مخالفین جو اہل باطل ہیں کس ذریعہ سے ہلاک ہوں گے۔ اور وہ وحی جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہے اس کے حامل کا جلال آخر دنیا میں کس طرح ظاہر ہوگا۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت مدنی ہے اور جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہے ابتدائی مدنی زمانہ کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کا کچھ حصہ اس کے نزول سے پیشتر نازل ہو چکا تھا، بالخصوص وہ حصہ جس میں جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن جنگ بدر سے پہلے کی یہ سورت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں کوئی ذکر اس جنگ کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے غلبہ کا ذکر محض بطور پیشگوئی ہی ہے۔

اٰیَاتُھَا 38 (47) سُوْرَۃُ مُحَمَّدٍ مَّدَنِیَّۃٌ (95) رُکُوْعَاتُھَا 4

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝١

جنہوں نے انکار کیا اور اللہ کے رستے سے روکا، ان کے عمل برباد کر دیئے۔(3070)

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝٢

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر اتارا گیا، اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کی برائیوں کو ان سے دور کر دیا اور ان کی حالت سنوار دی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝٣

یہ اس لیے کہ جو کافر ہیں وہ غلط رستے پر چلے اور جو ایمان لائے انہوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی حالتیں بیان کرتا ہے۔(3071)

3070- یہ انہی **اعمال کے برباد کرنے کا ذکر** ہے جو ان کے کفر اور اللہ کے رستے سے روکنے کے اعمال ہیں۔ کیونکہ یہ سورت دونوں فریق کے مقابلہ کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک طرف کافر ہیں جو اس وقت مسلمانوں پر غالب آ کر انہیں ان کے گھروں سے نکال چکے ہیں اور لوگوں کو دین اسلام کی طرف سے روکنے میں گویا کامیاب ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان ہیں جو اس وقت نہایت کسمپرسی کی حالت میں گھر بار چھوڑ کر مدینہ میں آ بیٹھے ہیں تو اس حالت میں یہ سورت نازل ہوتی ہے اور بتاتی ہے کہ کفار کا غلبہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا باقی نہ رہے گا اور مسلمانوں کی بیکسی کی حالت بھی باقی نہ رہے گی، نہ ان کی تکالیف باقی رہیں گی۔ جیسا اگلی آیت میں صفائی سے فرمایا۔ اور وہاں سَیِّاٰتِ سے مراد وہی تکالیف جسمانی ہیں جو اس وقت مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی تھیں۔

3071- یعنی کفار کے ان اعمال کفر و مخالفت اسلام کی بربادی اور مومنوں کی حالت کو اچھا بنانا، اس لیے ہے کہ کفار باطل کی پیروی کرتے

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۫ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ؕ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴

سو جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آجاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ (یاد رکھو) اور اگر اللہ چاہے تو انہیں (اور طرح) سزا دے دے لیکن (جنگ اس لیے ہوئی) تاکہ تمہیں ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔ اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے تو وہ ان کے عمل برباد نہیں کرے گا۔ (3072)

ہیں اور مسلمان حق کی۔ اور حق کی پیروی سے ضروری ہے کہ انسان کی حالت سنور جائے اور ﴿اَمْثَالَهُمْ﴾ سے مراد کفار اور مسلمانوں کی حالت یا ان کی صفات ہیں۔

3072- ﴿الْوَثَاقَ﴾ وَثَقَ کے لیے [دیکھو نمبر: 794] اور وَثَاقَ اور وِثَاقَ وہ ہے جس کے ساتھ کسی چیز کو باندھا جائے۔ ﴿وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ۝﴾ [الفجر: 26:89] ''اور ایسا جکڑے گا کہ کسی نے نہ جکڑا ہو۔'' (غ)

﴿اَوْزَارَهُمْ﴾ اَوْزَارَ۔ وِزْرٌ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 1044] اور [اَوْزَارَ الْحَرْبُ] سے مراد اس کے آلات از قسم سلاح ہیں۔ (غ)

﴿انْتَصَرَ﴾ اِنْتَصَرَ [دیکھو نمبر: 1923] اور ظالم سے انتصار اس سے بدلہ لینا اور اس کو سزا دینا ہیں۔ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝﴾ [القمر: 10:54] ''سو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں، تو میری مدد فرما۔'' ﴿وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝﴾ [الشوریٰ: 39:42] ''اور وہ کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔'' اور [اِنْتَصَرَ عَلٰى عَدُوِّهٖ] کے معنی ہیں اس سے سوال کہ اس کے دشمن کے خلاف اسے مدد دے اور تناصر ایک دوسرے کو مدد دینا ہے۔ (ل)

قیدی یا غلام بنانے کی ضروری شرط:

اول بتایا کہ کفار کو کس صورت میں قید کیا جا سکتا ہے اور یاد رکھنا چاہئے کہ کسی آزاد انسان پر اگر غلامی کا نام اسلام کی رو سے آ سکتا ہے تو انہی لوگوں پر آ سکتا ہے جنہیں غلبہ پا کر قید کر لیا گیا ہو۔ یہی مراد ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ [النحل: 71:16] ''جو ان کے ماتحت ہیں۔'' سے ہے۔ اس کی پہلی شرط ہے جنگ کا ہونا جس کا ذکر ﴿لَقِيْتُمُ﴾ میں ہے اور جنگ میں تو قتل ہی ہے۔ پھر جب دشمن مغلوب ہو جائے (اثخان کے لیے دیکھو [نمبر 1254]) تو جو پکڑے جائیں انہیں قید کر لینا ہے۔ اثخان کے معنی قتل کرنا نہ

سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ۚ﴿۵﴾ انہیں منزل مقصود پر پہنچائے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔

ہونا یہاں سے خود ظاہر ہے۔ اس لیے کہ یہ معنی ان الفاظ کے ہو سکتے ہی نہیں کہ جب انہیں قتل کر دو تو پھر قید کر لو۔ پس دشمن کا قید میں لینا صرف بعد جنگ اور غلبہ ہی جائز ہے۔ اور غلبہ کے بعد پھر قتل نہیں بلکہ قید کرنا ہے۔ پھر قید کر کے بھی ہمیشہ کے لیے انہیں غلام نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ان کا **آزاد کر دینا ضروری ہے**، خواہ دشمن قوم سے فدیہ لے کر آزاد کیا جائے اور خواہ بغیر فدیہ لینے کے محض بطور احسان۔ وہ ہمیشہ کے لیے قید یا غلامی میں نہیں رکھے جا سکتے اور یہ اسلام کا کھلا کھلا قانون ہے، اور اسی کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے آپ نے جنگ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کیا اور بہت سی جنگوں میں بطور احسان آزاد کیا۔ ایک حنین کی جنگ میں چھ ہزار قیدی بغیر ایک حبہ فدیہ لینے کے آزاد کیے۔ بنی مصطلق کی جنگ میں بغیر فدیہ کے قیدی آزاد کیے اور بنو نضیر کی مثال اس کے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ وہ جنگ میں مغلوب ہو کر قید نہ ہوئے تھے بلکہ اس شرط پر صلح کی تھی کہ جو فیصلہ سعد رضی اللہ عنہ دیں اسے ہر دو فریق مانیں گے۔ اور سعد رضی اللہ عنہ نے ان کا فیصلہ توریت کے حکم کے مطابق کر کے انہیں ان کی غداریوں کی وجہ سے مروا دینے کا فیصلہ دیا۔

قیدی کا قتل جائز نہیں:

اور اگر کبھی کسی ایک آدھ آدمی کو آپ نے مارنے کا حکم دیا تو وہ اس کے کسی اور جرم کی بنا پر تھا، نہ جنگ کرنے کی وجہ سے۔ پس یہی صحیح اسلامی قانون ہے جیسا کہ روح المعانی میں بھی ہے [وَظَاهِرِ الْآيَةِ عَلٰى مَا ذُكِرَهِ السُّيُوْطِيْ فِيْ أَحْكَامِ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ اِمْتِنَاعِ الْقَتْلِ بَعْدَ الْأَسْرِ]. اور لکھا ہے کہ حجاج نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک قیدی قتل کرنے کو بھیجا، تو آپ نے فرمایا یہ حکم ہمیں نہیں اور یہی آیت پڑھی۔ اور جن لوگوں نے قیدیوں کے قتل کو جائز کیا ہے تو وہ ان کی اجتہادی غلطی ہے، نص صریح اس کے خلاف ہے۔

کفار پر عذاب بصورت جنگ آنے میں حکمت:

اور یہ جو فرمایا: ﴿حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا﴾ تو مطلب یہ ہے کہ یہ قید میں لینا بھی اس وقت تک ہے جب تک جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور جب جنگ نہ ہو تو کسی کو قید میں لینا یا عارضی طور پر غلام بنانا بھی جائز نہیں۔ اور بعض نے جنگ کے رکنے کو نزول عیسیٰ سے خاص کیا ہے اور جنگ کے ذریعہ سے سزائے دشمن اس مصلحت پر مبنی تھی جیسا کہ یہاں صفائی سے فرمایا تا کہ ایک دوسرے کے ذریعہ سے لوگوں کی جودت اور روائت ظاہر ہو جائے، کوئی اور بلائے آسمانی وارد ہوتی تو مسلمانوں کو کمالات کے حصول کا موقع نہ ملتا۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپ کے صحابہ کو بھی حصول کمالات کا موقع دے اس لیے جنگ ضروری ٹھہری۔ اور یا اشارہ قیدیوں کو بطور احسان یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی طرف ہے کہ وہ تھے تو مستحق سزا کیونکہ مسلمانوں کو بڑے بڑے

وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝٦

اور انہیں جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان انہیں کرادی ہے۔ (3073)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝٧

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط کردے گا۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝٨

اور جو کافر ہیں ان کے لیے ٹھوکریں کھانا ہے اور ان کے عمل برباد کردے گا۔ (3074)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝٩

یہ اس لیے کہ انہوں نے اسے ناپسند کیا جو اللہ نے اتارا، سو اس نے ان کے عمل بیکار کردیئے۔

دکھ دیئے تھے۔ اور اللہ چاہتا تو یہی حکم دیتا کہ ایسے لوگوں کو قتل کردیا جائے مگر یہ احسان ان پر کیا تا کہ اس احسان عظیم سے مسلمان اپنے کمالات کو حاصل کریں، اور جنگ میں تو مسلمان بھی قتل ہوئے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اگر وہ قتل بھی ہوجائیں تو ان کے اعمال برباد نہیں ہوں گے اور دین حق کو پھیلانے کی جو کوشش انہوں نے کی وہ ناکام نہیں ہوگی۔

3073- ﴿عَرَّفَهَا﴾ عَرَّفَ کے معنی ہیں ایک چیز کی معرفت یا اس کا علم دے دیا۔ ﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ﴾ [التحریم: 3:66] ''تو اس کا کچھ حصہ بتادیا اور کچھ حصہ سے اعراض کیا۔'' اور ﴿عَرَّفَهَا﴾ کے معنی یہ بھی ہیں [جَعَلَ لَهُ عَرْفًا أَيْ رِيْحًا طَيِّبًا] یعنی اس کے لیے عرف یا خوشگوار ہوا پیدا کردی۔ اور یہاں ﴿عَرَّفَهَا﴾ کے معنی ہیں [طَيَّبَهَا وَ زَيَّنَهَا] یعنی اسے طیب اور خوبصورت بنایا۔ اور یا یہ معنی ہیں کہ ان کے لیے اس کا وصف بیان کیا اور اس کی طرف انہیں شوق دلایا اور انہیں اس کا رتبہ دکھایا۔ (غ) اور یہ معنی مفسرین نے بھی قبول کیے ہیں۔ (ر) اور پہلے معنی لے کر مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس جنت کی کچھ معرفت مومنوں کو یہاں بھی کرادی ہے۔ ایک تو ان کی کامیابیوں کے وعدوں کو پورا کرکے اور دوسرا اس **دنیا کی جنت روحانی** عطا فرما کر۔

3074- ﴿فَتَعْسًا﴾۔ تَعْس ٹھوکر کھانا ہے جس سے پھر انسان اٹھ نہ سکے اور نگونسار ہوجانا۔ (غ) اور اس سے مراد ہلاکت بھی ہے۔ (ل)

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝١٠

تو کیا وہ زمین میں پھرے نہیں، پس وہ دیکھ لیتے کہ ان کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ اللہ نے ان پر تباہی بھیجی اور کافروں کے لیے اس جیسی (سزائیں) ہی ہیں۔ (3075)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝١١ ع 1 11 5

یہ اس لیے کہ اللہ ان کا کارساز ہے جو ایمان لائے، اور کافروں کے لیے کوئی کارساز نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝١٢

اللہ (تعالیٰ) ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو کافر ہیں وہ چند روزہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح چارپائے کھاتے ہیں اور آگ ان کا ٹھکانا ہے۔ (3076)

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝١٣

اور کتنی بستیاں تھیں جو تیری اس بستی سے جس نے تجھے نکالا ہے طاقت میں بڑھ کر تھیں، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ پس کوئی ان کا مددگار نہ ہوا۔ (3077)

3075- ﴿اَمْثَالُهَا﴾ مراد ہے [اَمْثَالِ عَاقَبْتُهُمْ] یعنی ان کی عاقبت کی مثالیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ متعدد عذاب یا سزائیں ان پر آئیں گی۔

3076- اس لیے کہ انہوں نے غرض زندگی چارپایوں کی طرح صرف کھانے پینے کو ٹھہرا رکھا ہے۔ اور چونکہ اپنے قویٰ کو ان کاموں میں نہیں لگاتے ... جن سے راحت پیدا ہوتی ہے، اس لیے ان کا ٹھکانا آگ ہے۔

3077- اس آیت میں **کفار کے نبی کریم ﷺ کو مکہ سے نکالنے کا ذکر** ہے۔ گو وہ تو آپ کو قتل ہی کرنا چاہتے تھے لیکن نکالنے کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی ہے کہ ان کے اس فعل کی وجہ سے ہی آپ کو نکلنا پڑا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ گھر سے نکل کر غار کی طرف چلے تو پھر کر فرمایا: [اَنْتِ اَحَبُّ بِلَادِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلَى اللّٰهِ وَ اَنْتِ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی دلیل پر (قائم) ہے اس کی طرح ہوسکتا ہے جسے اس کا برا عمل اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

اس جنت کی (ایک) مثال ہے جس کا وعدہ متقیوں کو دیا جاتا ہے اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بگڑتا نہیں، اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزا نہیں بدلتا۔ اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہے۔ اور صاف کیے ہوئے شہد کی نہریں ہیں۔ اور ان کے لیے اس میں سب قسم کے پھل اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے۔ (کیا اس کے رہنے والے) ان کی مثل ہیں جو آگ میں رہنے والے ہیں اور انہیں ابلتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔ (3078)

اَحَبُّ بِلَادِ اللّٰهِ اِلَيَّ وَلَوْلَا اَنَّ اَهْلَكِ اَخْرَجُوْنِي مِنْكِ لَمْ اَخْرُجْ مِنْكِ] (ر) یعنی ''اے مکہ! تو اللہ تعالیٰ کے تمام شہروں سے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور تو مجھے بھی تمام شہروں سے بڑھ کر محبوب ہے اور اگر تیرے لوگوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں تجھ سے نہ نکلتا۔'' تب یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر چونکہ یہ ساری سورت بعد ہجرت کی ہے جب جنگ کی تیاری کفار کی طرف سے ہو چکی ہے اور مسلمانوں کو بھی دفاع کے لیے جنگ کرنے کی اجازت مل چکی ہے، اس لیے یہ قرین قیاس نہیں کہ اکیلی آیت پہلے کی نازل شدہ ہو اور یہاں بھی صاف پیشگوئی ہے کہ ان کفار کو ہم ہلاک کر دیں گے اور کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔

3078- ﴿غَيْر﴾ غَيْرِ کا استعمال کئی طرح پر ہے۔

اول: صرف نفی کے لیے۔ ﴿اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ [القصص: 50:28] ''جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔'' ﴿فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ [الزخرف: 18:43] ''جھگڑے میں کھول کر بات نہ کر سکے۔''

دوم: استثنا کے لیے۔ ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ﴾ [القصص: 38:28] ''میں تمہارے لیے اپنے سوائے کوئی معبود نہیں

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا

اوران میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں انہیں

جانتا۔'' ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾[فاطر: 3:35] ''سوائے اللہ کے کوئی اور پیدا کرنے والا ہے۔''

سوم: نفی صورت کے لیے بغیر اس کے مادہ کے، جیسے پانی جب گرم ہوتو اس کا غیر ہوتا ہے جب وہ ٹھنڈا ہو۔ ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾[النسآء: 56:4] ''جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کی جگہ ان کو اور کھالیں دے دیں گے۔''

چہارم: یہ کہ وہ کسی ذات کو شامل رکھنے والا ہو جیسے ﴿تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾[الأنعام: 93:6] ''جو تم اللہ پر ناحق کہتے تھے۔'' جہاں ﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ سے مراد باطل ہے۔ ﴿اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا﴾[الأنعام: 164:6] ''کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں۔'' ﴿وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾[القصص: 39:28] ''اور اس نے اور اس کے لشکروں نے ملک میں ناحق تکبر کیا۔'' ﴿وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾[التوبة: 39:9] ''اور تمہاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے گا۔'' ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَاۤ﴾[يونس: 15:10] ''اس کے سوا کوئی اور قرآن لا۔''

اور تَغْيِيْرٌ دو طرح پر ہے۔ ایک صورت کا تبدیل کرنا، بغیر اس کی ذات کے جیسے کہیں گے [غَيَّرْتُ دَارِيْ] یعنی اس کی عمارت کو بدل دیا اور دوسرے ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کا لے آنا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ [الرعد: 11:13] ''اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو (نہ بدلیں)۔'' (غ)

﴿اٰسِنٍ﴾ [اٰسَنَ الْمَآءُ] کے معنی ہیں پانی کی بو بگڑ کر بری ہوگئی اور ایسا پانی ﴿اٰسِنٍ﴾ ہے۔ (غ)

﴿لَّبَنٍ﴾ لَبَنٌ دودھ، ﴿عَسَلٍ﴾ شہد، ﴿اَمْعَآءَهُمْ﴾ اَمْعَآءٌ۔ مَعِیٌ کی جمع ہے انتڑیاں۔

جنت میں چار قسم کی نہریں:

یہاں چند چیزوں کا ذکر ہے اور ایک طرف اگر ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ یہ اس دنیا کی چیزیں نہیں تو دوسری طرف خود ان چیزوں کے اوصاف بھی ایسے بیان کر دیئے ہیں۔ وہ ایسا پانی ہے کہ اس کی بو بگڑتی نہیں، ایسا دودھ ہے کہ اس کا مزہ تبدیل نہیں ہوتا، ایسی شراب ہے جو لذت ہی لذت ہے۔ یعنی نہ اس کے مزہ میں نقص یا بگاڑ ہے، نہ اس کا نتیجہ سکر ہے۔۔۔ ایسا شہد ہے جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں۔ پھر فرمایا کہ سب قسم کے پھل بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کو ان سب کے ساتھ اکٹھا کر کے بتا دیا کہ ان نعمتوں کا رنگ کیا ہے۔ ﴿خَمْرٍ﴾ کے لفظ سے یہ خیال کر لینا کہ اسی دنیا کی شراب وہاں ہوگی، صحیح نہیں۔ یہ ﴿خَمْرٍ﴾ وہی ہے جس کو دوسری جگہ ﴿شَرَابًا طَهُوْرًا﴾[الدهر: 21:76] ''پاک کرنے والی پینے کی چیز۔'' کہا ہے۔ گویا انسان کو پاک کر دینے والی۔ اور یہاں ﴿خَمْرٍ﴾ یا ڈھانک لینے والی چیز اس کو اس لیے کہا ہے کہ وہ کمزوریوں کو ڈھانک کر انسان کو

الْعِلْمَ مَا ذَا قَالَ اٰنِفًا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾

جنہیں علم دیا گیا ہے، کہتے ہیں اس نے ابھی کیا کہا تھا۔ یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔ (3079)

وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾

اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں وہ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے اور انہیں ان کا تقویٰ دیا۔ (3080)

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾

تو یہ اور کچھ انتظار نہیں کرتے مگر (موعود) گھڑی کا کہ ان پر اچانک آجائے۔ سو اس کی نشانیاں تو آچکیں۔ پھر جب وہ آجائے گی ان کی نصیحت انہیں کہاں (مفید) ہوگی۔ (3081)

اعلیٰ مراتب پر پہنچانے والی ہے۔ اور یہاں چار قسم کی نہروں کا ذکر کیا ہے جو ہر ایک مومن کے لیے ہوں گی۔ ایک پانی کی جس سے زندگی ہے، دوسری دودھ کی جس سے قوت ملتی ہے، تیسری شراب کی جس سے لذت اور سرور ملتا ہے، چوتھی شہد کی جس سے شفا ملتی ہے۔ اور یہی چار چیزیں انسان کی راحت کے نقشہ کو مکمل کرتی ہیں۔ اور **بہشت میں مغفرت سے مراد** گناہوں کی بخشش نہیں، کیونکہ گناہوں کی بخشش کے بعد تو انسان بہشت میں داخل ہوگا۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کا خاص تعلق ہے جو اہل جنت کو میسر ہوگا۔

3079- ﴿اٰنِفًا﴾ آنْفٌ ناک کو کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کی آنْفٌ اس کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اٰنِفٌ بمعنی مُبْتَدَاءً ہے۔ (غ) یعنی شروع کرتے وقت۔

3080- ﴿تَقْوٰىهُمْ﴾ ان کا تقویٰ انہیں دیا یعنی انہیں متقی بنایا۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ انہیں ان کے تقویٰ کی راہیں بتا دیں اور بعض نے تقویٰ سے مراد جزائے تقویٰ لی ہے۔

3081- ﴿اَشْرَاطُهَا﴾۔ شَرْطٌ ہر حکم معلوم ہے جو کسی ایسے امر کے متعلق ہو جو اس کے واقع ہونے پر واقع ہو اور یہ امر اس کے لیے بطور علامت ہو اور اسی سے شَرَطٌ علامت کو کہا جاتا ہے اور [اَشْرَاطُ السَّاعَةِ] ساعت کی علامات ہیں۔ (غ)

﴿السَّاعَةَ﴾ کی اشراط سے مراد عموماً علامات قیامت لی گئی ہیں جن کے لیے [دیکھو نمبر: 1040] مگر یہاں لفظ ہیں ﴿فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا﴾ اس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: [أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ] (صحيح البخاری، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ"، حديث: 6504) اس لیے آپ کا ظہور ہی علامات

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع

سو جان لے کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے اور اللہ تمہارے آنے جانے اور تمہارے ٹھہرنے کو جانتا ہے۔ (3082)

قیامت کا ظاہر ہونا ہے، صحیح نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو محض ابتدا ہے۔ اور جو علامات قیامت حدیث میں بیان ہوئی ہیں ان میں آنحضرت ﷺ کا ظہور نہیں۔ پس اس ساعت سے مراد ساعت وسطی یا ان مخالفین کی تباہی ہے اور درحقیقت اسی کا ذکر اس سورت میں ہے اور اس کی علامات ظاہر ہو چکی تھیں۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی علامت یہی تھی کہ آنحضرت ﷺ مکہ سے نکل جائیں۔ ﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ﴾[الأنفال: 33:8] ''اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا'' اور ﴿فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۳﴾﴾ کی ترکیب اس طرح ہے کہ ﴿اِذَا جَآءَتْهُمْ﴾ جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ یعنی جب وہ ساعت آجائے گی [اَنّٰى لَهُمْ ذِكْرٰىهُمْ] یعنی پھر انہیں نصیحت کیا فائدہ دے گی۔ جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾﴾[الفجر: 23:89] ''اس دن انسان یاد کرے گا اور اس یاد سے اسے کیا فائدہ ہوگا؟''

3082- **ہر مسلم اپنے اور دوسروں کے لیے استغفار کرے:** اس سورت میں شروع سے ذکر دو گروہوں یعنی مومنوں اور کافروں کا چلتا ہے اور سوائے اس کے کہ قرائن قویہ ہوں خطاب قرآن شریف میں عام ہی ہوتا ہے اور یہاں بھی یہی صورت ہے۔ یعنی خطاب ہر مسلم کو ہے کہ اپنے قصور کی بھی حفاظت چاہے اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اور یہ خطاب خصوصیت سے رسول اللہ ﷺ کو نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کے لیے استغفار کیا کروں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں۔ اور یہ آیت پڑھی۔ (ج) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس آیت کے یہی معنی سمجھے کہ ہر شخص کو دوسرے کے لیے استغفار کرنا چاہئے۔ اور اگر آپ کے لیے بھی مانا جائے تو ذَنْۢبِكَ سے وہ ذنوب مراد ہیں جو ابھی سرزد نہیں ہوئے۔ کیونکہ انبیاء سے کسی ذنب کا سرزد ہونا قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے۔ ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾[الأنبیآء: 27:21] ''وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔'' [دیکھو نمبر: 2156] ہاں وہ بھی انسان کا ذنب کہلا سکتا ہے جو امکانی طور پر انسان سے سرزد ہو سکتا ہے اور اس کے لیے حفاظت چاہنا یہ ہے کہ وہ سرزد نہ ہو۔ اور یہی **استغفار انبیاء** ہے۔ [دیکھو نمبر: 258]

﴿مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ﴾ یعنی تمہاری بیداری میں اپنے امور میں متصرف ہونا اور نیند میں اپنی خواب گاہوں میں آرام کرنا۔ (ج) اور یا مُتَقَلَّبٌ دنیا کے متعلق ہے اور مَثْوٰی آخرت کے۔ (ر)

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾

اور جو ایمان لائے وہ کہتے ہیں کوئی سورت نازل کیوں نہیں ہوتی۔ پس جب ایک واضح معنی والی سورت نازل کی گئی اور اس میں جنگ کا ذکر کیا گیا تو تُو انہیں دیکھتا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ تیری طرف دیکھتے ہیں، اس شخص کی طرح جس پر موت (کے خوف) سے بیہوشی طاری ہو۔ سو ان کے لیے ہلاکت ہے۔ (3083)

طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ﴿۲۱﴾

فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کا کہنا (مناسب تھا) پھر جب معاملہ پختہ ہوگیا تو اگر یہ اللہ کے لیے (عہد کو) سچ کر دکھاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ (3084)

3083 - ﴿الْمَغْشِيِّ﴾ غَشِيَ کے معنی ہیں ڈھانکا اور [غَشِيَ عَلٰى فُلَانٍ] اسے اس چیز نے آلیا جس نے اس کے فہم پر پردہ ڈال دیا۔ ﴿كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ [الأحزاب: 19:33] ''اس شخص کی طرح جس پر موت کی بے ہوشی آجائے۔'' اسی سے ﴿الْمَغْشِيِّ﴾ ہے۔ (غ)

﴿فَاَوْلٰى﴾ اَوْلٰى کلمہ تہدید اور تخویف ہے جس سے اس شخص کو ڈرایا جاتا ہے جو ہلاکت پر پہنچ گیا ہو اس سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یا اس سے اسے خطاب کیا جاتا ہے جو ذلیل ہو کر ہلاکت سے بچ گیا ہو۔ پس دوبارہ اس کی مثل سے اسے روکا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا مکرر ہے۔ ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝﴾ [القيامة: 35:75] ''افسوس ہے تجھ پر اور افسوس۔'' (غ)

اس میں **مومنوں اور منافقوں کا مقابلہ** ہے یعنی مومن تو اس حالت کو دیکھ کر کہ کافر کس طرح تلوار لے کر اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں، یہ خواہش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دفاع کی اجازت دے۔ لیکن جب یہ حکم نازل ہوتا ہے تو منافق جن کے دلوں میں بیماری ہے اسے اپنے لیے ایک موت کی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر جنگ ہوئی تو مسلمانوں کے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے اور ﴿سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ﴾ سے مراد واضح المعنی ہے۔ کیونکہ جنگ کا پیش آنا تو پیشگوئی سے بھی معلوم ہوتا تھا مگر مسلمانوں کو وضاحت سے یہ حکم ابھی نہ دیا گیا تھا۔

3084 - یعنی چاہئے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے طاعت اور قول معروف اختیار کرتے اور امر کے پختہ ہونے سے مراد جنگ کا واقع ہونا ہے یعنی نزول حکم پر منہ سے اطاعت اختیار کرتے اور موقعہ پر اپنے عہد کو سچا کر دکھاتے، تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾

پس اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو۔ (3085)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾

یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ سو انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ (3086)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾

تو کیا قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ (3087)

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

وہ لوگ جو اپنی پیٹھوں پر پھر گئے، اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہوگئی۔ شیطان نے (اسے) ان کے لیے اچھا کر دکھایا اور انہیں لمبے وعدے دیئے۔ (3088)

3085- ﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ کے معنی یہاں دونوں طرح پر کیے گئے ہیں۔ اگر تم اس حکم سے پھر جاؤ یا اگر تم حاکم بن جاؤ۔ (ج) پہلی صورت میں ان کا کفار کے ساتھ ملنا فساد فی الارض اور قطع رحمی تھی۔ اس لیے کہ انہی منافقین کے رشتہ دار ہی مسلمان تھے، تو ان کو مروانا قطعی رحمی تھی۔ اور زمین میں فساد اس طرح پر کہ کافر فساد کر رہے تھے اور مسلمانوں کو محض ظلم سے تکلیفیں پہنچا رہے تھے۔

3086- ﴿فَاَصَمَّهُمْ﴾ اَصَمَّ۔ صَمَمٌ شنوائی کے حاسہ کا جاتے رہنا ہے اور اس شخص کے متعلق بھی کہا جاتا ہے جو حق کی طرف مائل نہیں ہوتا اور اسے قبول نہیں کرتا۔ ﴿فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا﴾ [المآئدۃ: 71:5] ''سو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے۔'' (غ) اور اگلی آیت میں بتا دیا کہ یہ بہرا اور اندھا کرنا ان کے عدم تدبر کی وجہ سے ہے۔

3087- ﴿اَقْفَالُهَا﴾ اَقْفَالٌ۔ قُفْلٌ کی جمع ہے، تالا۔ اور یہ ہر اس چیز کے لیے مثال ہوگیا ہے جو کسی فعل کے کرنے میں انسان کے لیے مانع ہو۔ (غ)

3088- ﴿اَمْلٰى لَهُمْ﴾ اَمْلٰى کے لیے [دیکھو نمبر: 573] اور یہاں مراد آرزوؤں کا لمبا کرنا یا اپنے جھوٹے وعدوں کو آگے آگے کرتے جانا ہے یا لمبی زندگی کا وعدہ دینا مراد ہے۔ اور بعض نے ضمیر یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف مانی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے اور ان پر عقوبت جلد نہیں لاتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾

یہ اس لیے ہوا کہ وہ انہیں کہتے ہیں جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم کو ناپسند کرتے ہیں کہ ہم بعض باتوں میں تمہاری فرمانبرداری کریں گے اور اللہ ان کے بھید کو جانتا ہے۔ (3089)

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾

تو کیا حالت ہوگی جب فرشتے انہیں وفات دیں گے ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں کو مارتے ہوں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع 3 9 7

یہ اس لیے کہ وہ اس بات کی پیروی کرتے ہیں جو اللہ کو غضب دلاتی ہے اور اس کی رضا کو ناپسند کرتے ہیں۔ سو اس نے ان کے عمل بیکار کر دیئے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾

آیا وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے خیال کرتے ہیں کہ اللہ ان کے کینوں کو باہر نہیں نکالے گا۔ (3090)

3089 - ﴿لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ﴾ کفار ہیں۔ ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [البقرة: 105:2] ''اہل کتاب میں جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے۔'' منافق انہیں کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری اطاعت کریں گے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے خلاف تمہیں مدد دیں گے۔ یا اشارہ اس کی طرف ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَ لَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا﴾ [الحشر: 11:59] ''کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو منافق ہیں وہ اپنے بھائیوں کو جو اہل کتاب میں سے کافر ہیں کہتے ہیں اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے معاملہ میں کبھی کسی کی اطاعت نہ کریں گے۔''

3090 - ﴿اَضْغَانَهُمْ﴾ اَضْغَانَ۔ ضِغْنٌ کی جمع ہے جس کے معنی سخت کینہ ہیں۔ اور کینوں کو باہر نکالنے سے مراد یہ ہے کہ انہیں ظاہر کر دے، کیونکہ منافق اپنے کینہ کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے اور یوں پتہ لگ جائے کہ کون منافق ہے اور یا مراد یہ ہے کہ کینہ کو دور کر دے اور دونوں طرح پر ہی ہوا۔

وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰

اور اگر ہم چاہیں تو ہم تجھے وہ (لوگ) دکھا دیں پس تو انہیں ان کی نشانیوں سے پہچان لے اور یقیناً تو انہیں (ان کے) طرز کلام سے ہی پہچان لے گا اور اللہ تمہارے عملوں کو جانتا ہے۔ (3091)

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ ۝۳۱

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کر دیں اور تمہارے حالات کو جانچ لیں۔ (3092)

3091 - ﴿لَحْنِ﴾ کلام کا اس طریق سے پھیرنا ہے جس پر وہ جاری ہے یا اعراب کے دور کرنے سے یا مٹا کر اور یہ مذموم ہے۔ اور اس کا اکثر استعمال اس طرح ہے اور با تصریح سے دور کر کے اور تعریض کی طرف اس کے معنی کو پھیر کر (غ) اور خوش آوازی پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس لیے اَلْحَنَ اسے کہتے ہیں جو بہت خوش آواز ہو۔ اور ابن کثیر کہتے ہیں ﴿لَحْنِ﴾ استقامت کی جہت سے مائل ہونا ہے۔

کفر یا نفاق کا نشان جسم پر نہیں ہوسکتا:

اور حدیث میں [أَلْحَنَ بِحُجَّةٍ] اسی معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو منافقوں کے ماتھے پر کوئی ایسا کلنک کا ٹیکا لگا دیتا کہ ہر شخص انہیں ان کی ظاہری علامات سے ہی پہچان لیتا۔ لیکن ایسا اس نے نہیں چاہا۔ ہاں جس طرز سے وہ کلام کرتے ہیں اس سے بھی پہچاننے والا انہیں پہچان سکتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ تو پہچانتے ہی تھے۔ لیکن ان کا کھلے طور پر ظاہر کر دینا ایک وقت تک مقدر نہ تھا، اس کی وجہ اگلی آیت میں دی ہے۔ ہاں آخر کار ان کے نام بھی آنحضرت ﷺ کو بتا دیئے گئے۔ ایسی روایتیں قابل قبول نہیں کہ بعض منافق رات کو سوئے تو صبح ان کے ماتھے پر لکھا ہوا تھا [هٰذَا مُنَافِقٌ] اللہ تعالیٰ کا ماتھے پر لکھنا یہی ہوتا ہے کہ اس کے افعال سے ظاہر کر دے۔ اسی طرح دجال کے متعلق جو آتا ہے کہ اس کے ماتھے پر کفر کا لفظ لکھا ہوا ہوگا، تو اس سے بھی مراد سیاہی سے لکھا ہوا ہونا نہیں، بلکہ افعال کی شہادت مراد ہے۔

3092 - منافقوں اور مسلمانوں کا امتیاز اس لیے ابتدا میں نہیں کیا گیا کہ تا کہ جہاد کرنے والوں اور صابروں کی کمال کوشش اور صبر کے نمونے ظاہر ہوں۔ ﴿اَخْبَارَكُمْ﴾ سے مراد ان کی خبریں یا حالات ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ مومنوں کے صبر اور کوشش کے نتائج دنیا میں ظاہر ہوں اور منافقوں کا نفاق ظاہر ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

جو کافر ہیں اور اللہ کے رستے سے روکتے ہیں اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں، اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہوگئی۔ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور وہ ان کے عملوں کو بے کار کر دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾

جو کافر ہیں اور اللہ کے رستے سے روکتے ہیں پھر وہ مرجاتے ہیں حالانکہ وہ کافر ہی ہیں۔ تو اللہ (تعالیٰ) انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۚ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۚ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

سو تم سست نہ ہو اور صلح کی طرف (نہ) بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہارے لیے تمہارے عملوں کو کم نہ کرے گا۔ (3093)

3093- ﴿يَّتِرَكُمْ﴾ يَتِرَ۔ وَتْرٌ اعداد میں شفع کے خلاف ہے یعنی طاق۔ اور وَتَرْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے کوئی امر مکروہ پہنچایا۔ (غ) اور [وَتَرَهٗ حَقَّهٗ وَ مَالَهٗ] کے معنی ہیں اس کا حق اور اس کا مال اسے گھٹا کر دیا۔ اور کمی یا نقصان کے معنی اس کے اس لیے آتے ہیں کہ وہ پہلے گویا کثیر تھا پھر اکیلا رہ گیا۔ (ل)

مطلب یہ ہے کہ جنگ شروع ہو چکی ہے تو دب کر اور مغلوب فریق کی حیثیت اختیار کر کے صلح کی طرف نہ بلاؤ۔ اس لیے کہ اس صورت میں مسلمانوں کو دبا کر بالکل نابود کر دیا جاتا۔ **ایسی صلح سے روکا ہے جس کے ساتھ وہن ہو**۔ یعنی کوئی شخص دشمن کے مقابلہ پر زور نہیں لگانا چاہتا اور اس سے ڈر کر ہمت ہار بیٹھا ہے۔ اس کا صلح کے لیے دشمن کو بلانا اپنی بربادی ہے اور یہ بھی بتایا کہ غلبہ تمہارے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کوشش اللہ کی راہ میں کرو گے اللہ اس کے اجر کو کم نہیں کرے گا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾

دنیا کی زندگی صرف کھیل اور بے حقیقت چیز ہے۔ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہارے اجر تمہیں دے گا اور تمہارے مال تم سے نہیں مانگے گا۔

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾

اگر وہ ان (اموال) کو تم سے مانگے اور تم سے الحاح کرے تو تم بخل کرو اور وہ (بخل) تمہارے کینوں کو باہر نکال دے۔ (3094)

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا

دیکھو تم وہ لوگ ہو جو بلائے جاتے ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ پس تم میں سے وہ ہے جو بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے تو وہ صرف اپنی جان سے بخل کرتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہارے سوائے کسی اور قوم کو بدل کر لے

3094 - پہلی آیت میں ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ تو وہ تمہیں اجر دے گا اور تمہارے مال سے تم سے نہیں مانگے گا۔ اور دوسری میں ہے کہ وہ تم سے مانگے تو تم بخل کرو۔ پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں کچھ ایمان ہو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ **اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگتا بلکہ وہ تمہیں کچھ اجر دینا چاہتا ہے**۔ لیکن اجر بغیر انسان کی محنت اور قربانی اور عمل کے نہیں ملتا۔ اس لیے تمہیں مال خرچ کرنا پڑے گا، تب ہی اجر ملے گا۔ منافقوں میں سب سے بڑا نقص یہی تھا کہ وہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو بڑی بھاری مصیبت سمجھتے تھے۔ تو انہیں بتایا ہے کہ جس ایمان کا تمہیں دعویٰ ہے کہ اگر تم میں واقعی وہ ایمان ہو تو تمہیں کبھی یہ مصیبت معلوم نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے نہیں مانگتا بلکہ تمہیں اجر دینے کے لیے اور تمہارے مراتب بلند کرنے کے لیے تمہیں خرچ کرنے کو کہتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر فرمایا: ﴿تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور دوسری آیت میں ان کی اصل حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ تم پر بڑا بڑا زور بھی دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم بخل کرتے۔ اور فی الحقیقت تمہیں اسلام سے بغض آخر کار ظاہر ہو کر رہے گا خواہ تم اسے کتنا بھی چھپانا چاہو۔

ع 4 10 8 يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ ع آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ (3095)

3095- **خدا کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے والی قوم زندہ نہیں رہ سکتی:** پچھلی دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں مومنوں کا ذکر تھا اور دوسری میں منافقوں کا۔ تو اب دونوں کا اکٹھا ذکر کر کے یا کل امت کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ تم کو جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جاتا ہے وہ تمہاری اپنی بھلائی کے لیے ہے۔ لیکن بعض لوگ تم میں سے بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے اس کا نقصان بھی خود اس کی اپنی ذات کو ہی پہنچتا ہے۔ اور اگر تم سب کے سب احکام الٰہی سے پھر جاؤ تو پھر اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ اور لوگوں کو کھڑا کر دے گا۔ روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں جن کے لانے کا یہاں ذکر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''یہ اور اس کی قوم۔'' اور پھر فرمایا کہ ''اگر ایمان ثریا پر ہو تو فارس کے کچھ لوگ اسے واپس لائیں گے۔''

سورۃ الفتح

نام وخلاصہ مضمون:

اس سورت کا نام اَلْفَتْحِ ہے اور اس میں 4 رکوع اور 29 آیتیں ہیں۔ اس سورت کا نام اس عظیم الشان فتح پر ہے جو اسلام کو صلح حدیبیہ میں حاصل ہوئی۔ ظاہری نظروں میں تو یہ کوئی فتح نہ تھی۔ بلکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے بڑے حصہ پر یہ امر شروع میں مخفی رہا کہ صلح حدیبیہ بھی کوئی فتح ہے۔ بلکہ وہ سب کے سب صلح حدیبیہ کی شرائط کو اسلام کے لیے ذلت کا موجب سمجھ کر مغموم تھے۔ یہاں تک کہ اس سورت کے نزول سے غم کی جگہ خوشی سے دل بھر گئے اور اس کا فتح مبین ہونا بعد میں واقعات نے ثابت کر دیا۔ یعنی اس صلح کے ساتھ آمد ورفت کے رستے کھل گئے اور مسلمانوں اور کفار کا باہم میل ملاپ ہو گیا اور اسلام کی خوبیاں دلوں میں گھر کرنے لگیں اور کثرت کے ساتھ لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ بلکہ اسلام کی کشش ایسی زبردست ثابت ہوئی کہ جو لوگ مسلمان ہوتے تھے وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر مقام عیص پر ساحل پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ کیونکہ بروئے شرائط معاہدہ وہ مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ رہ سکتے تھے۔ اور یوں یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام کی فتح دلوں پر تھی اور جب تلوار کی حکومت اٹھی تو کافر ہی مسلمان ہوئے، مسلمانوں میں سے کوئی کفر میں واپس نہ گیا۔

① مگر اس سورت میں صرف صلح حدیبیہ کی فتح کا ہی ذکر نہیں بلکہ پہلے رکوع میں یہ بتا کر کہ صلح حدیبیہ ایک فتح مبین ہے جو اسلام کے لیے بڑے بڑے برکات کا موجب ہوگی اور

② دوسرے میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو ان مشکلات کے وقت ساتھ نہیں ہوتے تھے۔

③ تیسرے میں فرمایا کہ یہ صلح عظیم الشان فتوحات اسلامی کا پیش خیمہ ہے جن میں سب سے پہلے یہودیوں پر فتح تھی، جو خیبر کے مقام پر حاصل ہوئی اور بعد میں دیگر فتوحات اور تیسرے درجہ پر بیرونی ملکوں کی فتوحات۔

④ اور ان سب کی خوش خبری سنا کر چوتھے رکوع میں بتایا کہ اسلام آخر کار کل دنیا کے مذاہب پر غالب آئے گا اور یوں ہر طرح سے اس سورت کا نام اَلْفَتْحِ موزوں ہے۔

تعلق وتاریخ نزول:

پچھلی سورت کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھا اور اس سورت کا نام جو اس کے بعد آتی ہے اَلْفَتْحِ ہے۔ گویا بتایا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور دنیا میں چاہتا تھا کہ فتح بھی اس کے ساتھ ہو۔ وہ دشمنوں سے مغلوب نہیں ہوسکتا، بلکہ سب دشمنوں پر غالب آئے گا۔ پہلوں پر بھی اور پچھلوں پر بھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام جہاں جائے گا وہاں فتح بھی اس کے ہمرکاب ہوگی۔

اس سورت کے نزول کی تاریخ یقین کامل کے ساتھ متعین کی جاسکتی ہے اور ساری سورت کا نزول ایک ہی وقت میں ہوا۔ یہ ثابت

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ (111) (48) اٰيَاتُهَا 29 رُكُوْعَاتُهَا 4

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ — ہم نے تیرے لیے ایک کھلی فتح (کی راہ) کھول دی ہے۔ (3096)

ہے کہ آپ اس سفر میں پہلی ذیقعد 6 ہجری کو نکلے اور دس دن سے کچھ زیادہ آپ کا قیام حدیبیہ میں رہا اور آپ کی واپسی میں حالت سفر میں اس سورت کا نزول ہوا۔ گویا یہ ذیقعد 6 ہجری کے آخری دن تھے۔ اور بظاہر جس وقت اس سورت کا نزول ہوا تو آپ مکہ سے قریب ہی تھے مگر چونکہ ہجرت کے بعد جو کچھ نازل ہوا وہ مدنی کہلائے گا، اس لحاظ سے یہ سورت مدنی ہے۔

3096- بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس فتح مبین کا ذکر اس آیت میں ہے وہ صلح حدیبیہ ہے۔ اور ابن کثیر میں سیدنا ابن مسعود اور سیدنا جابر اور سیدنا براء رضی اللہ عنہم کے اقوال نقل کیے گئے ہیں جن کے الفاظ قریباً ایک ہی ہیں۔ [إِنَّكُم تَعُدُّوْنَ الْفَتْحَ فَتْحَ مَكَّةَ، وَنَحْنُ نَعُدُّ الْفَتْحَ صُلْحَ الْحُدَيْبِيَةِ] تم فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اور روح المعانی میں زہری سے اس کی وجہ نقل کی ہے: [لَمْ يَكُنْ أَعْظَمُ مِنْ صُلْحَ الْحُدَيْبِيَةِ اِخْتَلَطَ الْمُشْرِكُوْنَ بِالْمُسْلِمِيْنَ وَسَمِعُوْا كَلَامَهُمْ وَتَمَكَّنَ الْإِسْلَامَ مِنْ قُلُوْبِهِمْ وَأَسْلَمَ فِيْ ثَلَاثَ سِنِيْنَ خَلْقَ كَثِيْرٌ وَكَثُرَ بِهِمْ سَوَادِ الْأِسْلَام] کوئی فتح صلح حدیبیہ سے بڑھ کر نہیں ہوئی۔ مشرکوں کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول ہوا اور انہوں نے ان کی باتوں کو سنا اور اسلام نے ان کے دلوں میں جگہ پکڑی اور تین سال میں بہت سی مخلوق اسلام لائی اور ان کے ساتھ سواد اسلام بہت بڑھا۔ اور جمہور کے نزدیک یہ ذکر صلح حدیبیہ کا ہی ہے اور یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور انس رضی اللہ عنہ اور شعبی اور زہری سے روایت ہے اور ابن عطیہ نے کہا یہی صحیح ہے۔ (ر) اور ابن جریر میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس مشہور روایت میں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا [أَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ] آخری الفاظ یوں ہیں [فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَفَتْحٌ هُوَ؟ قَالَ: نَعَمْ] یعنی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اور بعض لوگوں نے اس سے فتح مکہ مراد لی ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ فتح مکہ کا ذکر آگے اسی سورت میں آتا ہے۔ پس یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کی سب سے بڑی فتح وہی ہے جو صلح سے حاصل ہوئی، گو اس صلح میں مغلوب فریق کا پہلو ہی اختیار کیا گیا ہو۔ کیونکہ اسلام کی فتح دلوں پر ہے اور ظاہری فتح صرف جسموں پر ہوتی ہے، اور حقیقی فتح وہی ہے جو دلوں پر ہو۔ اور امام راغب نے یہاں فتح سے مراد ان علوم و ہدایات کا دیا جانا لیا ہے جو ثواب پر ہے اور مقام محمود تک پہنچانے کا ذریعہ ہوئے [دیکھو نمبر: 1124] اور واقعات نے یوں اسے فتح مبین ثابت کیا کہ اس کے ساتھ ہی کفار میں اشاعت اسلام کا دروازہ کھل گیا اور کثرت سے لوگ اسلام کے اندر داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ اگر حدیبیہ کو جاتے وقت آپ کے ساتھ صرف چودہ سو آدمی تھے تو ڈیڑھ سال بعد مکہ پر چڑھائی

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾

تا کہ اللہ ان قصوروں سے تیری حفاظت کرے جو تیرے ذمے پہلے لگائے گئے اور جو پیچھے لگائے جائیں گے اور اپنی نعمت کو تجھ پر تمام کرے اور تجھے سیدھے رستے پر چلائے۔ (3097)

کے وقت دس ہزار جاں نثار آپ کے ہمرکاب تھے۔ اور یوں توریت کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کی گئی تھی:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔'' [استثناء: 2:33]

3097 - **آنحضرت ﷺ کے غفر ذنوب سے مراد:** ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ﴾ یہ نتیجہ ہے فتح مبین یعنی صلح حدیبیہ کا۔ اس لیے اس کے یہ معنی کرنا کہ اللہ تعالیٰ تیرے گناہ بخش دے جو پہلے ہوئے یا جو بعد میں ہوں گے، کسی طرح صحیح نہیں۔ کیونکہ گناہوں کا بخشنا کسی صلح یا کسی فتح کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کو غفر ذنوب کا ذریعہ بتایا ہے اور وہ باتیں جو اس کا نتیجہ بتائی ہیں چار ہیں۔ غفر ذنوب، اتمام نعمت، ہدایت، نصرت۔ اگر غفر ذنوب سے مراد گناہوں کا بخشا لیا جائے تو اس کا باقی تینوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور نہ ہی صلح حدیبیہ سے کچھ تعلق رہتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم میں کہیں آنحضرت ﷺ کے کسی ذنب کا ذکر نہیں، بلکہ آپ کے مقامات عالیہ کا ہی ذکر ہے۔ اور تاریخ تو بتاتی ہے کہ اس وقت بھی جب ابھی آپ منصب نبوت پر فائز نہ ہوئے تھے آپ اَلْاَمِیْنُ کے پاک نام سے مشہور تھے۔ پس ﴿ذَنْۢبِكَ﴾ کے معنی آنحضرت ﷺ کے گناہ نہ تو سیاق سباق سے درست ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ اضافت بعض وقت حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ مثلاً ﴿بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ﴾ [المآئدۃ: 29:5] اثمی سے مراد وہ گناہ ہے جو تو میرے خلاف کرنے لگا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1814] اور ﴿اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ [الأنعام: 22:6] ''وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم جھوٹے دعوے کرتے تھے۔'' میں معنی تمہارے شریک نہیں، بلکہ مراد وہ شریک جو تم بناتے ہو اور ﴿اَيْنَ شُرَكَآءِيَ﴾ [النحل: 27:16] ''میرے شریک کہاں ہیں۔'' میں معنی میرے شریک نہیں، بلکہ مراد ہیں وہ جنہیں میرے شریک سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح یہاں ﴿ذَنْۢبِكَ﴾ کے معنی ہیں جو دوسروں کے زعم میں آنحضرت ﷺ کے ذنوب تھے یا وہ ذنوب جو دوسرے آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور انہی کا تعلق صلح حدیبیہ سے بھی تھا۔ کیونکہ بہت سی باتیں غلط طور پر دشمنان اسلام نے مشہور کر رکھی تھیں۔ اب جو صلح ہوئی اور مسلمانوں اور مشرکوں کا باہم میل جول ہوا اور اصل حقیقت پر انہیں آگہی ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ باتیں نادرست ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے وہ گرویدہ ہو گئے اور اسلام میں داخل

وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳ اور اللہ تجھے زبردست نصرت سے مدد دے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴ وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں تسکین نازل کی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں ترقی کریں۔ اور اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ (تعالیٰ) علم والا حکمت والا ہے۔(3098)

ہونے لگے۔ یہی آنحضرت ﷺ پر اتمام نعمت تھا کہ لوگ راہ حق کو قبول کر کے آپ کے حلقہ بگوش ہوں اور یہی وہ ہدایت ہے۔ یعنی منزل مقصود پر پہنچانا جس کا یہاں ذکر ہے، کیونکہ آپ کی منزل مقصود یہی تھی کہ ملک عرب نور اسلام سے منور ہو جائے۔ ورنہ ﴿يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ کے معنی اس شخص کے حق میں کیا ہو سکتے ہیں جو خود ﴿اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ [الشوریٰ: 52:42] ''تو یقیناً سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔'' کا مصداق ہو۔ اور یہی وہ نصر عزیز یا زبردست نصرت تھی جو آپ کو عطا فرمائی گئی، جس کی وجہ سے لوگوں کی گردنیں دین اسلام کے سامنے جھک گئیں۔ اور یہ جو ان ذنوب کے متعلق فرمایا مَا تَقَدَّمَ اور مَا تَاَخَّرَ تو مَا تَقَدَّمَ تو وہی ذنوب ہیں جو آپ کے متعلق مشتہر ہو چکے تھے اور مَا تَاَخَّرَ وہ ہیں جو ابھی ذنوب آپ کی طرف منسوب کیے جانے والے تھے۔ ﴿وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا﴾ [آل عمران: 186:3] ''اور ضرور تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ان سے جو مشرک ہوئے بہت سی دکھ دینے والی باتیں سنو گے۔'' [دیکھو نمبر: 583] اور ان کو اس لیے ساتھ ملایا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ اسی طرح ان الزامات سے بھی آپ کو پاک کر دے گا جو آپ پر لگائے جانے والے تھے۔ اور جس طرح اور میل جول باہمی سے ماتقدم کا فیصلہ ہوا اسی طرح جب ٹھنڈے دل سے عیسائی لوگ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے واقعات پر غور کریں گے تو انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے محض پادریوں کی سنی سنائی باتوں پر ایسے معائب آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیے تھے، جن سے فی الحقیقت آپ پاک ہیں۔ اور یہ آپ کا غفر ویسا ہی ہے جیسے **حضرت عیسیٰؑ کی تطہیر** ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [آل عمران: 55:3] جہاں مراد ہے کافروں کے لگائے ہوئے الزامات سے تجھے پاک کروں گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پاک کیا ہے۔ نہ اس لیے کہ آپ نعوذ باللہ بذات خود ناپاک تھے، بلکہ اس لیے کہ کافروں نے آپ کو ناپاک قرار دیا۔ آنحضرت ﷺ کا غفر ذنوب کیا نہ اس لیے کہ آپ کے کوئی ذنوب تھے، بلکہ اس لیے کہ کافروں نے آپ کی طرف ذنوب منسوب کیے تھے اور ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ﴾ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ باتیں جو ذنوب کا رنگ اختیار کر سکتی ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں ان سے محفوظ کر دے، یعنی ان مواقع پر ذنوب کو سرزد نہ ہونے دے۔ انبیاء کا ذنوب سے غفر یہی ہے کہ ان سے ذنب سرزد نہ ہو۔ [دیکھو نمبر: 258] و[نمبر: 366]

3098- **سکینت یا اطمینان کے نازل کرنے سے دشمن کا رعب دور کیا جاتا ہے۔** [دیکھو نمبر: 317] اور یہاں اشارہ اس واقعہ کی طرف

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾

تا کہ مومن مَردوں اور مومن عورتوں کو باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے۔ اور ان سے ان کی برائیاں دور کرے اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری کامیابی ہے۔

وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۚ﴿۶﴾

اور منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اللہ کے حق میں برے خیال رکھنے والوں کو سزا دے، انہی پر بری گردش ہے۔ اور اللہ کا غضب ان پر آیا اور ان پر لعنت کی اور ان کے لیے دوزخ تیار کیا۔ اور وہ بری جگہ ہے۔

وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۚ﴿۷﴾

اور اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

ہے کہ باوجود مسلمانوں کے سامان جنگ نہ رکھنے کے اور ان کی قلت کے اور کفار کی کثرت اور ان کے اپنے گھر سے قریب ہونے کے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایسی سکینت نازل فرمائی کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اگر کفار ان میں یہ آمادگی نہ دیکھتے تو وہ مسلمانوں کو کچل ڈالنے کی ہی تجویز کرتے اور صلح پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اسی لیے فرمایا ﴿لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ اور اس کی تائید [آیت نمبر: 18] سے ہوتی ہے ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ﴿۱۸﴾﴾ اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا ﴿لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ﴾ یعنی سکینت کے دلوں میں ہونے سے ان کا ایمان بڑھا۔ جس کا نتیجہ ان کا جنت کو حاصل کرنا ہے اور اسی ازدیاد ایمان کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ کفار اور منافقین کو ان کے ہاتھ سے سزا ملی جس کا ذکر [آیت نمبر: 6] میں ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ﴿۸﴾

ہم نے تجھے گواہ اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (3098)

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۹﴾

تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب کرو۔ اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو۔ (3099)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾ ع 1 10 9

وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پس جو کوئی (یہ بیعت) توڑتا ہے وہ اپنی جان کے نقصان کے لیے ہی توڑتا ہے اور جو اسے پورا کرتا ہے جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو وہ اسے بڑا اجر دے گا۔ (3100)

3098۔ **آنحضرت ﷺ کا شاہد ہونا:** یہاں آپ کی تین صفات بیان کی ہیں ﴿شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ مُبَشِّرٌ نیکوں کو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کو خوش خبری دینے والا اور نَذِيْرٌ بدی کے بدانجام سے ڈرانے والا۔ پس شَاهِدٌ یا گواہ وہ ہے جو اپنے نفس میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور نیکی کے نیک انجام کی گواہی دینے والا ہو۔ ﴿وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: 143:2] ''اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔'' [دیکھو نمبر: 178]

3099۔ ﴿تُوَقِّرُوْهُ﴾ تُوَقِّرُوْا۔ وَقْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 926] اور تَوْقِيْرٌ کے معنی تعظیم ہیں یعنی عظمت کرنا۔ اور ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ﴾ [نوح: 13:71] ''تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ سے عزت کی امید نہیں رکھتے۔'' میں وقار کے معنی عظمت ہیں۔ (ل)

نبی کو بھیجنے کی غرض بتائی اور تَعْزِيْرٌ [دیکھو نمبر: 1165] اور توقیر اللہ تعالیٰ کی بھی ہو سکتی ہے اور نبی کی بھی۔ اور آگے ﴿تُسَبِّحُوْهُ﴾ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

3100۔ ﴿يُبَايِعُوْنَكَ﴾ يُبَايِعُوْنَ۔ بَيْعٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 352] اور مُبَايَعَةٌ اور مُشَارَاةٌ خرید و فروخت دونوں پر بولے جاتے ہیں اور [بَايَعَ السُّلْطَانُ] کے معنی ہیں سلطان کے لیے طاعت کو لگانے کا عہد کیا، اس کے عوض میں جو وہ اسے عطا کرتا ہے اور

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

دیہاتیوں میں سے پیچھے رہے ہوئے لوگ تجھ سے کہیں گے ہمیں ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے مشغول رکھا، سو ہمارے لیے بخشش مانگ۔ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ کہہ، تو کون تمہارے لیے اللہ کے مقابل میں کسی چیز کا اختیار رکھتا ہے؟

اسے بَیْعَۃٌ اور مُبَایِعَۃٌ کہا جاتا ہے۔ ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ﴾[التوبۃ: 111:9] ''سو اپنے سودے پر جو تم نے کیا ہے خوش ہو جاؤ۔''

﴿عَلَيْهِ﴾ میں ضمہ کی وجہ یہ دی گئی ہے کہ یہ ہائے ھُوَ کی ہائے ہے جو مفہوم ہے جیسے لَہٗ اور ضَرَبَہٗ میں اور اس میں اس عہد کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں جس مُبَایِعَۃٌ یا بیعت کا ذکر ہے وہ **بیعت الرضوان** ہے جو حدیبیہ میں درخت کے نیچے ہوئی[18] اور یہ بیعت اس پر تھی کہ آنحضرت ﷺ کی نصرت کو نہ چھوڑیں گے گو موت بھی قبول کرنی پڑے یا یہ کہ قریش سے بھاگیں گے نہیں۔ اور آیت کے نزول سے پہلے یہ بیعت ہو چکی تھی۔ اور یہاں فرمایا کہ وہ بدل طاعت کا عہد تجھ سے نہیں اللہ سے ہے، گویا اصل طاعت تو اللہ تعالیٰ کی ہی ہے اور رسول درمیان میں واسطہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾[النسآء: 80:4] ''جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔'' اور ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ کے معنی ابن جریر نے دو طرح پر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ بیعت میں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا یعنی وہ نبی کریم ﷺ سے بیعت کر کے گویا اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ ید سے مراد قوت ہے اور معنی یہ ہیں کہ نصرت رسول میں اللہ کی طاقت ان کی طاقتوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ بیعت اسی بات پر کی تھی کہ وہ دشمن کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی نصرت کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کے ذکر سے جسم لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ صرف کنایہ کے طور پر ہے جیسے کہہ دیتے ہیں [فُلَانٌ بَيْنَ اَنْيَابَ الْمَنِيَّةِ] وہ موت کے دانتوں کے درمیان ہے۔ اور زجاج نے معنی کیے ہیں اللہ کا ہاتھ وفا یا ثواب میں ان کے اقرار طاعت والے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ اور مفردات راغب میں ہے کہ اولیاء اللہ کو [اَيْدِی اللّٰهِ] کہا جاتا ہے اور اس کے معنی یہاں ﴿يَدُ اللّٰهِ﴾ ہے یعنی آنحضرت ﷺ کے ہاتھ کو ﴿يَدُ اللّٰهِ﴾ کہا ہے اور آپ کا ہاتھ چونکہ ان کے ہاتھوں کے اوپر تھا اس لیے فرمایا ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو حدیث میں ہے [وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطُشُ بِهَا] (صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب: التَّوَاضُعِ، حديث: 6502) یعنی بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے

شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾

اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے یا تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرے۔ بلکہ اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ (3101)

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾

بلکہ تم نے خیال کیا تھا کہ رسول اور مومن اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ تمہارے دلوں کو اچھا معلوم ہوا اور تم برا خیال دل میں لائے۔ اور تم ہلاک شدہ قوم تھے۔

وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتا، تو ہم نے کافروں کے لیے بھڑکائی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور پھر دوسرے معنی بھی دیئے ہیں یعنی یہ کہ ﴿يَدُ اللّٰهِ﴾ سے مراد اس کی نصرت اور اس کی نعمت اور اس کی قوت ہے۔ (غ)

3101- **اعراب کی کمزوری:** صلح حدیبیہ کے واقعہ سے کچھ ہی پہلے کفار قریش ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہو چکے تھے اور ابھی ان کی قوت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ ایک رؤیا کی بنا پر عمرہ کے لیے نکلتے ہیں اور چودہ پندرہ سو کی تعداد میں مسلمان بھی ساتھ نکلتے ہیں، جنگ پیش آجانے کا خطرہ تو لگا ہوا ہی تھا۔ مدینہ کے اردگرد کے بعض دیہاتی لوگوں نے خیال کیا کہ اس حالت میں آپ کے ساتھ نکلنا خطرہ سے خالی نہیں، گو آپ قربانیاں بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ ان قبائل کے نام جہینہ، مزینہ، غفار، اشجع لکھے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ یہاں گھر میں بیٹھے تو مسلمانوں کو کفار چھوڑتے نہیں، پھر گھر سے باہر نکل کر خود ان کے گھر میں چلے جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اس لیے وہ ساتھ نہ گئے، یہی مخلفین ہیں۔ یہاں ان کی قلبی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ واپسی پر عذر کریں گے کہ مالوں کا اور بال بچے کا محافظ کوئی نہ تھا۔ فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے اور یہ جو فرمایا کہ ﴿فَمَنْ يَّمْلِكُ﴾ تو مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو تم مال اور اہل کی خاطر رک گئے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اعمال بد کی سزا آئے گی تو اس وقت اس سے کون چھڑائے گا۔ ﴿كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾﴾ بتاتا ہے کہ انہیں ان کے اعمال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دکھ اور سکھ کے لیے ارادہ الٰہی

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۴﴾

اور اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (3102)

سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵﴾

جب تم غنیمت کے حاصل کرنے کے لیے جاؤ گے تو پیچھے رہے ہوئے لوگ کہیں گے ہمیں اپنے ساتھ جانے دو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔ کہہ، تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ اسی طرح اللہ (تعالیٰ) نے پہلے سے فرمادیا ہے، تو کہیں گے بلکہ تم ہم پر حسد کرتے ہو۔ بلکہ یہ خود بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ (3103)

تو تمہارے اعمال پر ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی سزا آجائے تو پھر اسے کوئی شخص دور نہیں کرسکتا۔

3102- **عذاب میں رحمت:** باوجود اس کے کہ جسے چاہے بخشے، جسے چاہے عذاب دے، آخر پر صفات غفور رحم کا ہی ذکر کیا۔ جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس کے غضب پر سبقت لے گیا ہے، بلکہ یہ بھی کہ اس کا عذاب دنیا بھی انسان کی بہتری کے لیے ہے۔ یعنی وہ ایسی چیز ہے کہ انجام کار انسان کی بھلائی کا موجب ہے۔ پس اس کا عذاب بھی بتقاضائے رحم ہی ہے جو انجام کار اس پر ہوگا۔

3103- **تبدیل کلام اللہ سے مراد:** یہ سورت آنحضرت ﷺ پر حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی اور وہ باتیں جن کا یہاں ذکر ہے بطور پیشگوئی ہیں جو بعد میں واقع ہونے والی تھیں اور وہ مغانم جن کی طرف یہاں مسلمانوں کے جانے کا ذکر ہے جنگ خیبر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ [آیت: 18، 19] میں فرمایا کہ بیعت رضوان والوں کو ہم نے بعض خاص مغانم کا وعدہ دیا ہے اور یہ خیبر کے مغانم تھے۔ مجاہد اور قتادہ سے یہی روایت ہے اور ابن جریر نے اور دیگر مفسرین نے اس کو صحیح مانا ہے۔ اور صحیح احادیث میں یہ موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب حدیبیہ سے مغانم خیبر کا وعدہ کیا تھا۔ (ر) اور مخلفین کا یہ کہنا کہ ہم بھی ساتھ چلیں اس وعدہ الٰہی کے خلاف تھا، کیونکہ وہ وعدہ صرف بیعت رضوان والوں سے مخصوص تھا۔ اس لیے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے وہی وعدہ مراد ہے جس کا ذکر آگے [آیت: 18] میں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا تبدیل کلام اللہ سے مراد اس میں تحریف نہیں بلکہ ان وعدوں کا پورا نہ ہونا ہے جو اس میں ہیں۔ اور یہ جو فرمایا ﴿كَذٰلِكُمْ قَالَ

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾

پیچھے رہے ہوئے دیہاتیوں سے کہہ دے کہ تم ایک سخت جنگ کرنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، ان کے ساتھ جنگ کرو گے یہاں تک کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں۔ پس اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا بدلہ دے گا، اور اگر تم پھر جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے پھر گئے، تو تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (3104)

اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾ تو اس سے مراد ہے کہ تمہاری طرف واپس آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا کیونکہ سورت رستے میں ہی نازل ہوئی تھی۔ اور مخلفین کے ساتھ یہ معاملہ بعد میں پیش آیا۔ اور جن لوگوں نے اس سے اشارہ اس آیت کی طرف لیا ہے ﴿فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا﴾ [التوبة: 83:9] ''تو کہہ دے میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔'' تو انہوں نے غلطی کی ہے۔ اس لیے کہ یہ قول غزوۂ تبوک سے تعلق رکھتا ہے جو حدیبیہ کے تین سال بعد پیش آیا اور اسی وقت ہی سورۂ توبہ کا بھی نزول ہوا تھا۔ پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جب مخالفین جنگ خیبر میں نکلنے کے وقت یہ کہیں کہ ہمیں بھی ساتھ لے چلو تو اس وقت ان کو کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پہلے سے ہی اطلاع دے چکا ہے کہ تم اس میں ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔

3104- یہ قوم کون ہے؟ فارس و روم، ہوازو غطفان، بنوحنیفہ۔ مختلف نام لیے گئے ہیں اور گو جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے صحیح یہی ہے کہ جب قرآن شریف میں نام نہیں اور نہ کسی حدیث صحیح میں تو ہم بھی تعیین نہیں کر سکتے۔ لیکن اس قوم کا ذکر ان الفاظ میں کہ وہ ﴿اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ ہے یعنی سخت جنگ کرنے والی قوم، صاف بتاتا ہے کہ یہ عرب سے باہر کی اقوام ہیں یعنی فارس و روم کیونکہ ان دونوں طاقتوں سے عرب کے لوگ خائف تھے اور گو وہ برائے نام آزاد تھے، مگر فارس و روم کی سلطنتیں جو کچھ چاہتیں ان کے ملک کے اندر کر سکتی تھیں اور عرب کے بعض حصوں پر بھی قابض تھیں۔ یہ بڑی عظیم الشان اور پرانی بادشاہتیں تھیں اور زبردست مسلح اور قواعد دان فوجیں رکھتی تھیں۔ ﴿اَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ میں یہ خوش خبری دی ہے کہ ان کے ساتھ جنگوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فرمانبردار ہو جائیں گے اور اَوْ بمعنی حَتّٰی ہے۔ اس سے یہ مراد لینا کہ یا وہ مسلمان ہو جائیں گے یا ان سے لڑائی کرو گے، بے معنی سی بات ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ **تلوار اور اسلام** ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے ساری تعلیم قرآنی اور اصول دین کو باطل کرنا ہے۔ جو کتاب ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرة: 256:2] ''دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں۔'' کی تعلیم کھلے الفاظ میں پیش کرتی ہے، جو جنگ کو جائز نہیں ٹھہراتی جب تک کہ دشمن ابتدا نہ کرے۔ وہ یہ تعلیم

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور نہ لنگڑے پر تنگی ہے اور نہ بیمار پر تنگی ہے۔ اور جو شخص اللہ (تعالیٰ) اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اور جو کوئی پھر جائے اسے دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔

ع 2 7 10

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾

یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔ سو اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ پس ان پر تسکین نازل کی اور انہیں بدلے میں ایک قریب فتح دی۔ (3105)

نہیں دے سکتی کہ لوگوں کے سامنے تلوار اور اسلام کو پیش کرو۔

3105- اسی آیت کی وجہ سے اس بیعت کا نام **بیعت الرضوان** مشہور ہے اور یہ حدیبیہ کے مقام پر ایک سمرہ یعنی کیکر کے درخت کے نیچے ہوئی۔ اصحاب بیعت رضوان کی تعداد تیرہ سو، چودہ سو اور پندرہ سو بیان کی گئی ہے اور صحیح چودہ سو ہی ہے۔ واقعات اس بیعت کے یہ ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ذیقعد 6 ہجری کی پہلی تاریخ مدینہ سے ایک رؤیا کی بنا پر نکل کر عمرہ کے ارادہ سے حدیبیہ کے مقام پر پہنچے جو مکہ سے نو میل ہے، تو آپ نے ایک شخص خراش نام کو قریش کے پاس اس غرض کے لیے بھیجا کہ انہیں اطلاع دے کہ آپ صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں اور کوئی غرض نہیں، تاکہ ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مگر انہوں نے اس کے اونٹ کو مار ڈالا اور خود اس کو مار دینا چاہتے تھے مگر بعض لوگوں نے روک دیا۔ تب آپ ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا، مگر قریش نے ان کی بات کو بھی نہ سنا اور کہا کہ خود طواف کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے بغیر نہیں کر سکتا۔ تب انہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو قید کر دیا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے ہیں اور آپؐ نے فرمایا کہ ہم نہیں جائیں گے جب تک ان سے بدلہ نہ لے لیں۔ اور ایک منادی نے آواز دی کہ روح القدس آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی ہے اور آپ کو بیعت لینے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ (ر) اور بخاری میں ہے کہ یہ بیعت موت پر تھی اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ اس بات پر تھی کہ ہم بھاگیں گے نہیں اور بخاری میں سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جب اگلے سال ہم نکلے تو اس درخت کا ہمیں پتہ نہ ملا۔

وَّ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

اور بہت سے مال غنیمت جنہیں وہ لیں گے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

بیعت سے قوت کا پیدا ہونا:

اس بیعت کا نتیجہ بیان فرمایا ہے ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ﴾ اطمینان خاطر حاصل ہوا اور ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت نازل ہوئی اور ان کے دل مضبوط ہو گئے اور ہر قسم کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہا۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ایک طاقتور دشمن کے عین گھر میں ہونے کے اس قدر دشمن کی بے رعبی ان کے دلوں میں تھی کہ وہ ان شرائط صلح پر بھی راضی نہ تھے اور مرنے مارنے کو تیار تھے۔ اور ﴿فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ میں اشارہ ان کے صدق و اخلاص کی طرف ہے اور ﴿اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ میں جس **قریبی فتح کا ذکر ہے وہ فتح خیبر ہے** جو کہ حدیبیہ سے واپسی کے جلد بعد ہی ظہور میں آ گئی، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ وغیرھما سے مروی ہے۔ اور حسن نے فتح ہجر کہا ہے اور صحیح بخاری میں ہے کہ اہل بحرین سے آپ نے صلح کی اور مجوس ہجر سے جزیہ لیا۔ (ر) مگر پہلا قول صحیح ہے کیونکہ آگے [آیت:27] میں صاف فرمایا: ﴿فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ یعنی یہ فتح قریب خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف سے پہلے پہلے ہوگی۔ [دیکھو نوٹ نمبر: 3113] جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ عمرہ کے لیے نکلنے سے پیشتر آپ خیبر کو فتح کر چکے تھے اور اگلی آیت میں مغانم کثیرہ سے مراد مغانم خیبر ہیں جیسا کہ احمد کی حدیث میں ہے۔ (ر) یا فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہے اور مغانم کثیرہ میں اشارہ اور فتوحات کی طرف ہے جیسے فتح مکہ، حنین وغیرہ۔ میرے نزدیک دوسری بات کو ترجیح ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ۔ آنحضرت ﷺ کا اس موقعہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لینا حالانکہ وہ نہ صرف سچے دل سے مسلمان تھے بلکہ اسلام کے لیے اپنا سب کچھ فدا کر چکے تھے اور بارہا اپنی جانیں اور سر بھی خدا کی راہ میں پیش کر چکے تھے، بتاتا ہے کہ بعض وقت **خاص ضروریات کے لیے بھی بیعت کی ضرورت** واقع ہو جاتی ہے۔ یہ وہ بیعت نہیں جو عام طور پر صوفیاء لیتے ہیں، بلکہ ایک خاص غرض کے لیے بیعت لی گئی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت لی گئی۔ جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے جو اوپر نقل ہوئے کہ روح القدس نے آپ پر نازل ہو کر آپ کو حکم دیا کہ بیعت لیں۔ اسی طرح اگر اس امت میں کوئی مجدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر اسی کے حکم کے ماتحت بیعت لے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ لبیک کہیں۔ یہ بیعت ایک قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے جیسے یہاں بھی اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے سکینت نازل فرمائی۔ اسی قبیل سے وہ بیعت ہے جو اس صدی کے مجدد اور اس امت کے مسیح نے لی۔ جس کی غرض صرف ایک قوی جماعت کا تیار کرنا ہے جو عیسائیت کا مقابلہ کرے اور کسر صلیب کے کام کو اتمام کو پہنچائے۔

صحابہؓ کے اخلاص کی سند:

قرآن کریم کے ایسے ایسے صریح الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان مومنوں پر راضی ہے جنہوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی۔ اہل تشیع کا صحابہ کے متعلق نفاق وغیرہ کے الفاظ منہ پر لانا کلام الٰہی کا صریح مقابلہ ہے۔ کیا ان میں ابوبکر و عمر و عثمان

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَ لِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲۰﴾

تمہارے ساتھ اللہ نے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنہیں تم لوگے، پھر یہ تم کو جلدی دلوادی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تاکہ مومنوں کے لیے نشان ہو، اور تمہیں سیدھے رستے پر چلائے۔ (3106)

وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

اور اَور (فتوحات) بھی ہیں جن پر تمہیں قدرت نہیں تھی، اللہ نے ان کا احاطہ بھی کرلیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (3107)

رضی اللہ عنہم نہ تھے۔ بلکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ ہاتھ پر رکھا، اس لیے کہ وہ اس وقت اہل مکہ کی قید میں تھے اور انہی کے متعلق خبر کی وجہ سے اس بیعت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

3106- یہاں پھر دہرایا ہے کہ ایک مغانم کثیرہ ہیں اور دوسری وہ فتح ہے جو جلد عطا فرمائی۔ اور مغانم کثیرہ سے مراد وہی فتوحات مکہ، حنین وغیرہ ہیں جن کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور ﴿فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ والی فتح فتح قریب ہے، یعنی خیبر۔ اور یہ دہرانا تاکید کے لیے ہے اور ﴿كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ﴾ میں بتایا کہ اب قریش تم کو تکلیف نہ پہنچا سکیں گے، کیونکہ اس سے پہلے وہ تین حملے مدینہ پر کر چکے تھے۔ گویا بتادیا کہ ان کے حملوں کا اب خاتمہ ہے اور یا ﴿كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ﴾ میں اشارہ صلح حدیبیہ کی طرف ہے جیسا کہ [آیت:24] میں ذکر ہے۔ بلکہ صلح حدیبیہ نے ویسے بھی دشمنی کا خاتمہ کردیا کیونکہ پہلے کفار مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے تھے، اب صلح کی وجہ سے ان ایذاؤں کا خاتمہ ہوا۔ اسی لیے اس کو آیت کہا ہے اور ہدایت صراط مستقیم قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس سے اسلام پھیلا اور یوں [آیت:2] کے مضمون کی تائید اس سے ہوتی ہے۔

3107- یہ اور فتوحات جن کو یہاں ﴿لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا﴾ فرمایا ہے **فتوحات فارس وروم** و دیگر ممالک ہیں۔ ﴿لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا﴾ اس لیے کہا کہ عرب کی کیا مجال تھی کہ ان ممالک کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔ وہ خود بھی ان سلطنتوں سے اس قدر مرعوب تھے کہ ان کے چند سپاہی ملک کے اندر آکر جسے چاہتے پکڑ لیتے، تو وہ عذر نہ کرتے تھے۔ یوں اس سورت میں اگر ایک طرف یہ خوش خبری سنائی کہ صلح قائم ہوکر اسلام کی ترقی کی راہ نکل آئی، تو دوسری طرف یہ بھی بتادیا کہ فتوحات ملکی کا بھی مسلمانوں کو وعدہ دیا جاتا ہے جو صرف ملک عرب تک محدود نہ ہوں گی بلکہ ان مقامات پر بھی ہوں گی جن کا وہم وگمان بھی عرب کے لوگوں کو نہ ہوسکتا تھا۔

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

اور اگر وہ جو کافر ہیں تمہارے ساتھ جنگ کرتے تو پیٹھیں پھیر دیتے، پھر وہ نہ کوئی دوست پاتے اور نہ کوئی مددگار۔ (3108)

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

اللہ کا قانون ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

وَ هُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

اور وہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکہ میں روک رکھا، بعد اس کے کہ تمہیں ان پر فتح دی۔ اور اللہ (تعالیٰ) جو تم کرتے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔ (3109)

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ

وہی ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روک دیا اور قربانی کو بھی جو روکی گئی کہ اپنے ٹھکانے پر

3108- یہاں بتایا کہ گو مصلحت الٰہی سے صلح ہوگئی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان خائف تھے یا جنگ پیش آتی تو وہ بھاگ اٹھتے۔ اگر کافر ان کے ساتھ جنگ کرتے تو وہی پیٹھ دکھاتے۔ جیسا کہ پہلے بھی کافر ہی بھاگتے رہے۔ بلکہ اگلی آیت میں فرمایا کہ ہمیشہ سے یہی اللہ کا قانون ہے کہ انبیاء اللہ کے ساتھ جنگ کرنے والے ہی شکست کھاتے ہیں۔

3109- اس آیت میں دونوں فریقوں کے جنگ سے رکے رہنے کا ذکر ہے حالانکہ کفار نے تو مسلمانوں کے قاصدوں تک کو گرفتار کر کے جنگ کے لیے تیاری ظاہر کی۔ اور مسلمان بھی ان سخت شرائط کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر مصلحت الٰہی کا یہی تقاضا ہوا کہ جنگ نہ ہو۔ صلح کی بنیاد پڑ کر ایک طرف خونریزی کا خاتمہ ہو اور دوسری طرف اسلام ترقی کرے۔ اور ﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ میں یا تو اشارہ سابقہ فتوحات اسلامی کی طرف ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے اور یا اس چھوٹے سے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو خود حدیبیہ میں پیش آیا کہ قریش کے اسّی آدمیوں نے چھپ کر آنحضرت ﷺ پر حملہ کرنا چاہا تھا، مگر خود قید ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے بالآخر انہیں معاف کر دیا۔

يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ پہنچے۔(3110) اور اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں
نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ جنہیں تم نہیں جانتے کہ تم انہیں پامال کردو گے پھر تمہیں

3110- ﴿مَعْكُوْفًا﴾ مَعْكُوْف۔ عَكُوْفٌ [دیکھو نمبر: 159] گویا اپنے آپ کو کسی امر پر روک لینا ہے اس لیے ﴿مَعْكُوْفًا﴾ کے معنی مَحْبُوْسٌ۔ مَمْنُوْعٌ ہیں یعنی ردّ کی گئی۔(غ)

آنحضرت ﷺ کا روکا جانا اور شرائط صلح حدیبیہ:

یہاں بتایا ہے کہ کفار نے کس حالت میں آنحضرت ﷺ کو روکا، حالانکہ خانہ کعبہ سے کبھی کسی کو روکا نہ گیا تھا اور سخت ترین دشمن بھی حج کے ایام میں حرم میں آسکتے تھے مگر آنحضرت ﷺ کی عداوت اس قدر ان کے دلوں میں ترقی کر گئی تھی کہ باوجود قربانیاں ساتھ ہونے کے اور باوجود یہ علم ہو جانے کے کہ سوائے زیارت وطواف بیت اللہ کے اور آپ کا کچھ منشا نہیں، حرم کی حد پر پہنچے ہوئے چودہ سو آدمیوں کو حج سے روک دیا گیا۔ آخر جب قریش کو علم ہوا کہ مسلمان مرنے مارنے پر تیار ہیں تو سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا، مگر ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس سال حج کی اجازت ہرگز نہ دی جائے گی۔ سہیل کے ساتھ جو شرائط طے ہوئیں وہ حسب ذیل تھیں اور یہ معاہدہ دس سال کے لیے تھا۔

① مسلمان اس سال بغیر حج کیے واپس چلے جائیں۔

② اگلے سال آئیں مگر تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کریں۔

③ مکہ میں جو مسلمان ہیں ان کو ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو اسے نہ روکیں۔

④ مکہ والوں میں سے اگر کوئی شخص مدینہ جائے تو مسلمان پابند ہوں گے کہ اس کو واپس کر دیں۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی مکہ چلا جائے تو قریش اسے واپس نہ کریں گے۔

⑤ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس فریق کے ساتھ چاہیں شریک معاہدہ ہو جائیں۔

ابھی معاہدہ لکھا نہ گیا تھا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ جو سہیل کے فرزند تھے اور مکہ میں اسلام لا چکے تھے پہنچے اور اپنی حالت زار رسول اللہ ﷺ کو دکھائی۔ آنحضرت ﷺ نے بہتراچاہا کہ وہ معاہدہ سے مستثنٰی ہوں مگر سہیل نہ مانا۔ معاہدہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا لکھنا بھی سہیل نے نہ مانا۔ محمد رسول اللہ کے لفظ کٹوا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا گیا۔ حج کرنا نہ ملا۔ حکم ہوا اسی جگہ قربانیاں کر کے واپس چلو۔ ان سب باتوں کی وجہ سے <u>**مسلمان سخت مغموم تھے**</u>۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جرأت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ رسول برحق نہیں؟ فرمایا یقیناً ہوں۔ کہا پھر کیا ہم حق پر نہیں؟ فرمایا ہیں۔ کہا پھر دین میں ہم پر ایسی ذلت کیوں ڈالی جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا میں خدا کے حکم کے مطابق کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سورۂ فتح نازل ہوئی جس سے مسلمانوں کے سارے غم اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔

تَطَـَٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

ان کی وجہ سے لاعلمی میں کوئی نقصان پہنچ جائے، تاکہ اللہ (تعالیٰ) جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ الگ ہوجاتے تو جو اِن میں سے کافر تھے ہم انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرتے۔ (3111)

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾ ع

جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد ٹھان لی (اور) ضد بھی جاہلیت کی، تو اللہ (تعالیٰ) نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین اتاری اور انہیں تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اسی کے اہل تھے اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (3112)

3111- یہاں بتایا ہے کہ مکہ میں کچھ مومن بھی تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ جنگ نہ ہو کیونکہ جنگ میں وہ بھی پامال ہوجاتے اور ان کا مارا جانا قومی نقصان یا مسلمانوں کا اپنا ہی نقصان تھا۔ اس لیے فرمایا ﴿فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ﴾ اور یہ فی الواقع ایک اور رنگ کا بھی نقصان تھا۔ کیونکہ انہی لوگوں کی تحریک سے پھر دوسرے لوگ بھی کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے۔ اگر لڑائی ہوجاتی تو اسلام کی ترقی میں بڑی بھاری رکاوٹ پیدا ہوجاتی۔ اس کی طرف اشارہ ﴿لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ میں ہے۔ مفسرین نے یہاں افسوس اور رنج جو مسلمانوں کو اس وجہ سے پہنچے گا یا ان کے قتل کا گناہ یا دیت کا دینا یا کفار کی طعنہ زنی کہ مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو مار ڈالا، مراد لیے ہیں۔ مگر صرف پہلی وجہ درست ہوسکتی ہے باقی باتیں قابل قبول نہیں۔ اور ﴿لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جنگ کو روک دینا صرف اس لیے تھا کہ تا بہت سے لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل کرے یعنی اسلام کی توفیق دے اور آخری الفاظ میں بتایا ہے کہ مومنوں اور کافروں کا ملا ہوا ہونا کافروں کے بھی بچاؤ کا موجب ہوگیا۔ اگر مومن ان سے ملے ہوئے نہ ہوتے تو جنگ ہوکر ہلاک ہوجاتے۔

3112- ﴿حَمِيَّةَ﴾ قوت غضبیہ کا جوش ہے [دیکھو نمبر: 1288] اور اَنِفَةٌ یعنی عار اور غیرت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (ل) اور یہاں مراد ان کا اصرار ہے کہ اس سال آنحضرت ﷺ اور مسلمان حج نہ کریں۔ حالانکہ صلح بھی ہوگئی، پھر بھی شرط یہی ٹھہرائی کہ حج کیے بغیر واپس جائیں۔ کیونکہ انہوں نے صاف کہا تھا کہ اگر ہم حج کرنے دیں گے تو اہل عرب ہم پر طعن کریں گے کہ

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

اللہ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ اگر اللہ (تعالیٰ) نے چاہا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے اپنے سر منڈواتے اور بال کٹواتے، کچھ خوف نہ کرو گے۔ سو وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ پس اس سے پہلے ایک قریب فتح عطا کی۔ (3113)

مسلمان اپنی طاقت کے بل بوتے پر حج کر کے چلے گئے۔ اس لیے اس کو ﴿حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ کہا ہے یعنی کوئی سچی غیرت نہ تھی بلکہ جھوٹی شیخی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلمۂ تقویٰ پر لگا دیا یعنی انہوں نے خونریزی سے بچنے کے لیے اس ذلت کو برداشت کر لیا، یہی کلمۂ تقویٰ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کی تعریف کی ہے کہ وہ واقعی اس بات کے حق دار اور اہل تھے۔ مفسرین نے کلمۂ تقویٰ سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو لیا ہے۔ مگر سیاق اس معنی کو نہیں چاہتا۔

3113- ﴿صَدَقَ﴾ یہاں صدق بالفعل سے مراد ہے یعنی ایک امر کا تحقق۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے رؤیا کو سچا کر دیا۔ (غ) ﴿مُحَلِّقِيْنَ﴾ حَلْق عضو معروف ہے اور حَلَقَهٗ کے معنی ہیں اس کا حلق کاٹ دیا۔ پھر بالوں کے کاٹنے (یعنی منڈوانے) پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ﴾ [البقرة: 196:2] ''اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔'' (غ) اور حُلْقُوْمٌ کے معنی بھی حلق ہی ہیں۔ ﴿فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝﴾ [الواقعة: 83:56] ''تو کیوں نہیں ہوتا کہ جب (روح) گلے میں آ پہنچتی ہے۔'' (ل)

آنحضرت ﷺ کی رویائے طواف بیت اللہ:

آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے کہ آپؐ نے خواب دیکھا کہ آپ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے۔ پس آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی خبر دی۔ پھر جب آپ حدیبیہ کے سال نکلے تو ان میں سے کسی جماعت کو شک نہیں تھا کہ یہ رؤیا اسی سال پوری ہوگی۔ لیکن جب صلح ہو گئی اور آپ واپس لوٹ آئے تو صحابہ کے دلوں میں کچھ خیال گذرا کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہاں تک کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں سوال کیا اور کہا کیا آپ نے نہ فرمایا تھا کہ ہم خانہ کعبہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال حج کریں گے۔ عرض کیا نہیں۔ تب فرمایا کہ یقیناً تم خانہ کعبہ پہنچو گے اور اس کا طواف کرو گے۔ (ث) اور ایک روایت میں ہے کہ ایک فرشتہ آنحضرت ﷺ پر آیا اور اس نے کہا ﴿لَتَدْخُلُنَّ ... الخ﴾ (ر) اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے رؤیا میں صرف اس قدر دیکھا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کا طواف کریں گے اور یہ محض اجتہاد تھا کہ اسی سال طواف ہوگا۔ لیکن آپ چودہ سو آدمی کے ساتھ اسی رؤیا کی بنا پر نکلے۔ اور آخر

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۲۸﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اور اللہ گواہ بس ہے۔ (3114)

واقعات نے بتایا کہ اس رؤیا کا پورا ہونا آئندہ سال پر مقدر تھا۔ اس سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ جو خواب یا الہامات بطور پیشگوئی ہوں ان میں سب تفصیلات پر آنحضرت ﷺ کو بھی مطلع نہ کیا جاتا تھا۔ دوم یہ کہ **خواب یا الہام کی تعبیر میں اجتہادی غلطی نبی سے بھی ہوسکتی ہے۔** (لیکن شریعت میں نبی سے اجتہادی غلطی نہیں ہوسکتی) جس کی اصلاح بعد میں اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہوجاتی ہے۔ سوم یہ کہ ملہم کا اپنے اجتہاد کو صحیح یقین کر کے کسی فعل کا کر لینا جائز ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ یقین کر کے کہ حج اسی سال ہوگا، چودہ سو آدمیوں کے ساتھ سفر اختیار کیا۔

یہ سورت تو اس وقت نازل ہوئی جب آپ حدیبیہ سے واپس آ رہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ یقین دلایا کہ رسول اللہ ﷺ کا **وہ رؤیا سچا** اور منجانب اللہ تھا اور پورا ہو کر رہے گا۔ اور مسلمان امن کی حالت میں خانہ کعبہ میں جائیں گے۔ یہاں تک کہ حج کر کے سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حالت احرام سے باہر نکلیں گے اور کسی کا خوف نہیں ہوگا۔ اور اس سے پہلے پہلے ایک فتح قریب آپ کو حاصل ہوگی۔ یہ فتح قریب جیسا کہ نوٹ [نمبر: 3106] میں دکھایا جا چکا ہے فتح خیبر تھی۔ آنحضرت ﷺ حدیبیہ سے ذیقعد 6 ہجری میں واپس ہوئے اور ذوالحج اور محرم مدینہ میں ٹھہرے اور صفر 7 ہجری میں خیبر کی طرف نکلے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کے ہاتھ پر ایک حصہ کو بزور شمشیر اور ایک کو صلح سے فتح کرایا اور اس میں صرف وہی لوگ گئے اور انہی پر مال غنیمت بھی تقسیم ہوا جو بیعت الرضوان میں شامل تھے اور نبی کریم ﷺ جب دوبارہ عمرہ کو نکلے تو مکہ کے قریب پہنچ کر آپ نے ہتھیار ایک جگہ چھوڑ دیئے اور سردارانِ کفار غیظ وحسد کی وجہ سے مکہ سے باہر نکل گئے تاکہ اس نظارہ کو نہ دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ کس شان وشوکت سے اس پاک گھر کا طواف کر رہے ہیں، جہاں سے کفار نے آپ کو نکال دیا تھا۔ لیکن لکھا ہے کہ عورتیں اور بچے بازاروں میں اور کوٹھوں پر جمع تھے اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہے تھے۔ اور سیدنا عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ آپ کی اونٹنی کی باگ پکڑے یہ شعر پڑھ رہے تھے جن میں آتا ہے [خَلُّوا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيلِهِ] (سنن نسائی، باب مناسك الحج، باب إِنْشَادِ الشِّعْرِ فِي الْحَرَمِ وَالْمَشْيِ بَيْنَ يَدَيِ الإِمَامِ، حديث: 2886) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ طواف کعبہ میں اور صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے تاکہ مشرکوں کو معلوم ہوجائے کہ آپ قوت رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کافر کہا کرتے تھے کہ یثرب کے بخار نے آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اسی لیے آپ نے حکم دیا تھا کہ پہلے تین طوافوں میں لوگ دوڑ کر چلیں۔ (ث)

3114- اس آیت میں یہ توجہ دلائی ہے کہ ایک کفار عرب پر ہی اسلام کا غلبہ مقدر نہیں بلکہ **دنیا کے سب مذاہب پر یہ مذہب غالب آ کر**

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ
اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي
التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ

محمد (ﷺ) اللہ کا رسول ہے اور جو اس کے ساتھ ہیں
کافروں کے مقابلہ میں قوی، آپس میں رحم کرنے والے۔ تو
انہیں رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا
ہے۔ وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں۔ ان
کا نشان ان کے مونہوں پر سجدوں کے اثر سے (ظاہر)
ہے۔ (3115) یہ ان کی مثال توریت میں ہے

رکوع 15

رہے گا اور اللہ کی گواہی کا ذکر اس لیے کیا کہ ظاہر حالات بسا اوقات اس کے مخالف نظر آئیں گے۔

3115- ﴿اَشِدَّآءُ﴾ شَدِیْدٌ کی جمع ہے اور شِدَّةٌ قوت اور بہادری کو بھی کہتے ہیں۔ اور شَدِیْدٌ قوی آدمی کو کہتے ہیں۔ (ل) شِدَّةٌ کا استعمال عقد میں بھی ہے اور بدن میں بھی اور قوائے نفس میں بھی اور عذاب میں بھی۔ ﴿كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [الروم: 9:30] ''وہ ان سے قوت میں بڑھ کر تھے۔'' ﴿عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰى ۙ﴾ [النجم: 5:53] ''اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا ہے۔'' ﴿غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ [التحریم: 6:66] ''سخت (اور) طاقتور۔'' ﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِیْدٌ﴾ [الحشر: 14:59] ''ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے۔'' ﴿فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ﴾ [قٓ: 26:50] ''سخت عذاب میں ڈال دو۔'' اور شدید بخیل کو بھی کہتے ہیں گویا کہ وہ باندھ دیا گیا ہے۔ ﴿وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۚ﴾ [العادیات: 8:100] ''اور وہ یقیناً مال کی محبت میں بڑا سخت ہے۔'' (غ) ﴿رُحَمَآءُ﴾ رَحِیْمٌ کی جمع ہے۔

صحابہؓ کے اوصاف جلیلہ:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ یا تو یہ پورا جملہ علیحدہ ہے جب غلبہ دینی کا ذکر کیا تو یہ بھی بتا دیا کہ وہ غلبہ دینی محمد ﷺ کی رسالت سے ہی وابستہ تھا۔ اور یا جب ہدایت اور دین حق دے کر رسول بھیجنے کا ذکر کیا تو بتا دیا کہ اس رسول کا نام محمدؐ ہے۔ پھر آپ کے ساتھیوں کا ذکر کیا اور ان کے بعض اوصاف بیان کیے۔ پہلا ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ ہے اس کے معنی کافروں پر سختی کرنے والے نہیں بلکہ کفار کے مقابل پر قوی اور مضبوط ہیں۔ جیسے ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ [المآئدۃ: 54:5] یعنی ان سے مرعوب نہیں ہو جاتے، ان کے اثر کو قبول نہیں کرتے۔ مقابلہ ہو جائے تو مضبوطی اور قوت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ دوسرا وصف ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ہے۔ یعنی آپس میں ایسے نہیں کہ دوسرے کے اثر کو قبول نہ کریں۔ بلکہ ایک دوسرے پر رحم کرنے والے ہیں۔ یہ دونوں اوصاف ایسے ہیں جن سے قومی ترقی وابستہ ہے۔ قدرت میں ہر ایک شے کی ترقی اسی سے وابستہ ہے کہ جو امور اسے نقصان پہنچانے والے ہیں ان کے اثر کو قبول نہ کرے اور اندرونی ترکیب میں اس کے اجزا ایک دوسرے کے معاون ہوں۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ع 4 3 12

اور ان کی مثال انجیل میں کھیتی کی طرح، جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے مضبوط کیا، سو وہ موٹی ہوئی پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہوگئی، کسانوں کو خوش کرتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو غضب میں لائے۔ اللہ نے ان میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں حفاظت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ (3116)

اسی کے مطابق حدیث صحیح میں ہے [مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآدب، باب تَرَاحُمِ الْمُؤْمِنِينَ وَتَعَاطُفِهِمْ وَتَعَاضُدِهِمْ، حديث: 6751) مومنوں کی مثال آپس کی محبت اور رحم میں ایک جسم کی مثال ہے۔ [الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا] (صحيح البخاري، كتاب الصلوٰة، باب تَشْبِيكِ الأَصَابِعِ فِي الْمَسْجِدِ وَغَيْرِهِ، حديث: 481) مومن، مومن کے لیے دیوار کی طرح ہے جس کا بعض بعض کو قوت دیتا ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی مانگتے ہیں جس سے مراد حسنات دنیا بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی رضا بھی، یعنی حسنات آخرت۔ اور ان کے **مونہوں پر نشانیوں کے ہونے سے مراد** ماتھے پر سیاہ نشان نہیں بلکہ وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے والوں کے چہروں پر ہوتا ہے۔ ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ ﴿۲۴﴾﴾ [المطففين: 24:83] ''تو اُن کے چہروں پر نعمتوں کی تازگی معلوم کرے گا'' اور گو بعض نے اس سے مراد قیامت کے دن نور کا ظاہر ہونا لیا ہے، مگر صحیح یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی نظر آ جاتا ہے۔ چنانچہ مجاہد نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ وہ نشان نہیں جو تم دیکھتے ہو۔ بلکہ وہ اسلام کا نشان اور اچھی صفت اور خشوع ہے اور خود مجاہد سے بھی مروی ہے کہ اس سے مراد خشوع ہے۔ (ج) اور ایک شخص نے جب انہیں کہا کہ میں تو اسے وہ نشان سمجھتا ہوں جو ماتھے پر پڑ جاتا ہے، تو آپ نے فرمایا یہ تو اس شخص کے ماتھے پر بھی ہو سکتا ہے جو فرعون سے زیادہ سخت دل ہو۔ (ث) اور جابر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [مَنْ كَثُرَتْ صَلاَتُهُ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ] (سنن ابن ماجه، باب: مَا جَاءَ فِي قِيَامِ اللَّيْلِ، حديث: 1394) جو رات کو بہت نماز پڑھتا ہے اس کا منہ دن کو بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ اسی قسم کے اور بھی صحابہ کے اقوال ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا اثر انسان کے ظاہر پر بھی ہوتا ہے۔ اور لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی خالص نیات اور حسن اعمال کی وجہ سے جو شخص ان کی طرف دیکھتا تھا ان کے ظاہر و باطن کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ (ث) اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کی ناک پر سجدے کا نشان دیکھا تو فرمایا تیری ناک تیرے منہ کی صورت ہے، سو اسے خراب نہ کر۔ (ر)

3116- ﴿زَرْعٍ﴾ زَرْعٍ۔ اِنْبَاتٌ یعنی اگانا ہے اور فی الحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے نہ انسان کا۔ ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ

الزّٰرِعُوْنَ﴾ [الواقعة: 64:56] ''کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔'' اور ﴿ زَرْعٍ ﴾ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مراد مَزْرُوْعٌ یعنی اگائی ہوئی چیز یا کھیتی لی جاتی ہے۔ ﴿فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا﴾ [السجدة: 27:32] ''پھر اس کے ساتھ کھیتی نکالتے ہیں۔'' (غ) ﴿الزُّرَّاعَ﴾ زَارِعٌ کی جمع ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ﴾ یعنی جو اوپر ان کے اوصاف بیان ہوئے یہی توریت اور انجیل میں بھی ہیں۔ یا تو اس لحاظ سے کہ پیشگوئیوں میں ایسا ذکر ہے مثلاً توریت انہیں قدوسی قرار دیتی ہے اور انجیل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے باغ کو لے کر ان لوگوں کو دے گا جو اس کے پھل عین وقت پر دیتے ہیں اور یا مراد یہ ہے کہ مومنوں کی یہی صفات توریت اور انجیل میں بھی ہیں اور ﴿ كَزَرْعٍ ﴾ سے ان کی ایک اور مثال دی ہے جس میں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ گو ابھی مسلمان تھوڑے نظر آتے ہیں مگر **چونکہ حق ایک بیج کی طرح** ہے، اس لیے یہ بڑھے گا اور پھیلے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے قدرتی نشوونما کو نہیں روک سکتی۔ اور ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ میں تمثیل سے اصل کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ میں یا تو مسلمانوں کی موجودہ کمزوری کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں کمزور دیکھ کر کافر غضب میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تباہ کر دیں اور یا آئندہ قوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ اس مضبوطی کی حالت کو پہنچ جائیں تو پھر کافر انہیں دیکھ دیکھ کر غیظ میں آئیں گے، مگر ان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ اس مثال میں بھی یہی سمجھایا ہے کہ اسلام آخرکار دنیا میں پھیل جائے گا اور کہ اس کی ترقی تدریجی ہوگی۔ جس طرح کھیتی آہستہ آہستہ بڑھتی اور پھیلتی ہے۔

سورۃ الحجرات

نام:

اس سورت کا نام اَلْحُجُرَاتِ ہے اور اس میں 2 رکوع اور 18 آیتیں ہیں۔ اس سورت کا اصل مضمون جماعت اسلامی کے نظام کو قائم کرنا اور باہمی محبت ووُداد کا پیدا کرنا ہے اور سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہر ایک فرد جماعت کو کس طرح مؤدب رہنا چاہئے۔ اور چونکہ جماعت میں اسی قدر محبت اور الفت بڑھے گی جس قدر زیادہ محبت، الفت اس پاک وجود سے ہے جو اس کی روح کے قائمقام ہے۔ یعنی رسول خدا ﷺ کی محبت جن کی نسبت فرمایا:[لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُونَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِينَ](صحيح البخارى، كتاب الايمان، باب: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ ، حديث: 15) اس لیے سورت کی ابتدا اس سے کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے تقدم اختیار نہ کرو اور اپنی آوازوں کو بھی رسول کے سامنے پست رکھو۔ اور یہ نہ صرف بتقاضائے محبت وادب تھا بلکہ نظام جماعت کے لیے بھی ضروری تھا۔ اور ان لوگوں کو روکا جو باہر سے آتے تو فوراً رسول اللہ ﷺ کے حجروں پر آوازیں دینا شروع کرتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اہم قومی کام جو رسول اللہ ﷺ کی توجہ کو چاہتے تھے، ان کے لیے بھی آپ کو تنہائی میسر نہ آتی تھی۔ اسی مناسبت کے لحاظ سے اس سورت کا نام اَلْحُجُرَاتِ ہوا۔ اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو ساری وہ راہیں سکھائی ہیں جن سے قوم میں باہم محبت پیدا ہوسکتی ہے۔ بغیر تحقیق کے ایک دوسرے کے خلاف کچھ کارروائی نہ کر بیٹھیں۔ اگر باہم دو گروہوں میں لڑائی بھی ہوجائے تو من حیث الجماعت مسلمان ان میں اصلاح کی کوشش کریں اور زیادتی کرنے والے کے خلاف جنگ تک کرنے کے لیے تیار رہیں تاکہ جماعت کا امن قائم رہ سکے۔ پھر جن باتوں سے عداوت پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے کی تحقیر، ایک دوسرے پر عیب لگانا، ایک دوسرے کے نام رکھنا، دوسروں کے اقوال وافعال کی نسبت بدظنی کرنا، دوسروں کی چھپی ہوئی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہنا، پیٹھ پیچھے ان کی کمزوریوں کا ذکر، ان تمام باتوں سے روک کر بتایا کہ تم سب انسان یکساں ہو، کسی قوم کو دوسری قوم پر فخر نہ کرنا چاہئے۔ کہیں کا رہنے والا ہو، کسی قوم اور قبیلہ سے ہو، کسی رنگ کا ہو معزز ہونے کا معیار صرف ایک ہی ہے یعنی تقوی اللہ۔ یا اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حقوق کی رعایت۔ جو شخص جس قدر زیادہ دوسروں کے حقوق کی پروا کرتا ہے اسی قدر زیادہ اس کی عزت اور مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ پھر مسلمانوں میں سے اس سخت کمزور گروہ کا ذکر کیا جو ابھی برائے نام ہی اسلام میں شامل ہے اور دوسری طرف کامل مومنوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

تعلق وتاریخ نزول:

اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے۔ یہ گویا اس کے آخری حصہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی تفسیر ہے اور یوں بھی جب فتح کا ذکر کیا اور اس میں یہ اشارہ کیا کہ لوگ اسلام میں داخل ہوں گے، تو ان نئے داخل ہونے والے کے لیے اداب کا ذکر بھی ضروری تھا اور وہ یہاں کیا۔ سورت کا نزول 9 ہجری کا ہے اور یہ مدنی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (کسی معاملہ میں) اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(3117)

3117- ﴿تُقَدِّمُوْا﴾ تَقْدِيْمٌ سے ہے اور تَقَدُّمٌ چار طرح پر ہے۔ جیسا کہ قَبْل کے معنی میں بیان ہوا (یعنی مکان کے لحاظ سے، زمانہ کے لحاظ سے، مرتبہ کے لحاظ سے، ترتیب صناعی کے لحاظ سے) قَدَّمَ کسی چیز کو آگے کیا یا آگے بھیجا۔ ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ﴾ [المجادلة: 13:58] ''کیا تم ڈر گئے کہ اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دیا کرو۔'' ﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ [المآئدة: 80:5] ''کیا ہی برا ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے۔'' اور [قَدَّمْتُ فُلَانًا اَقْدَمَهٗ] کے معنی ہیں اس کے آگے آگے چلا۔ ﴿يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [هود: 98:11] ''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا۔'' (غ) اور یہاں ﴿لَا تُقَدِّمُوْا﴾ کے معنی زجاج نے کیے ہیں کہ جب تمہیں کسی کام کا حکم دیا جائے تو اسے اس کے اس وقت سے پہلے نہ کرو جس وقت تمہیں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور [قَدَّمَ بَيْنَ يَدَيْهِ] کے معنی ہیں تَقَدَّمَ یعنی آگے بڑھا۔ اور زجاج کے نزدیک تَقَدِّمُوْا اور تَقَدَّمُوْا کے ایک ہی معنی ہیں۔ (ل) روح المعانی میں ہے کہ یہ قَدَّمَ متعدی سے ہے یعنی **ایک چیز کو دوسری سے آگے کرنا** اور پھر دو احتمال بیان کیے ہیں۔ یعنی یا یہ کہ مفعول کو چھوڑ دیا گیا ہے اور نفس فعل کی تقدیم ہی مراد ہے یعنی [لَا تَفْعَلُوْا التَّقْدِيْمَ] تقدیم مت اختیار کرو اور یا یہ کہ مفعول کو عام رکھنے کی خاطر حذف کر دیا ہے۔ اور ابن جریر کئی معنی دیتے ہیں جن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کتاب اور سنت کے خلاف مت کہو یا یہ اس کی کلام سے پہلے کلام نہ کرو۔

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ [السبأ: 31:34] ''ہم اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے۔'' میں ﴿بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ سے مراد اس سے پہلی کتابیں ہیں۔ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝﴾ [السبأ: 46:34] ''وہ صرف تمہیں سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہے۔'' میں مراد لقائے عذاب ہے یعنی اس بات سے ڈرانے والا کہ اگر تم نافرمانی کرو تو تمہیں عذاب شدید ملے گا۔ اور ﴿نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا﴾ [البقرة: 66:2] ''عبرت ان کے لیے جو ان کے سامنے تھے۔'' میں مراد یا تو وہ امتیں ہیں جو پیدا ہو چکیں اور اس وقت سامنے موجود تھیں اور یا مراد وہ گناہ ہیں جو پہلے گزر چکے۔ ﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ﴾ [الأعراف: 17:7] ''پھر میں ضرور ان کے سامنے سے ان پر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے اونچا نہ کرو اور نہ اس سے پکار پکار کر بات کرو، جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے عمل بے کار ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ (3118)

آؤں گا۔'' میں مراد ﴿مَا تَقَدَّمَ﴾ ہے یعنی ان کو گمراہ کروں گا یہاں تک کہ وہ اسے جھٹلائیں گے جو پہلے گزر چکا اور امر بعث کو بھی جو بعد میں آنے والا ہے۔ اور [بَيْنَ يَدَيْكَ] ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو تمہارے سامنے ہو۔ (ل) اور یہاں مراد ﴿بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ سے اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنا یا ان کے فیصلہ یا اذن سے پہلے کسی معاملہ کا فیصلہ کر دینا ہے۔ یعنی جب تک اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ایک معاملہ میں نہ ملے تم خود اس میں پیش دستی نہ کرو۔ اور جب حکم مل جائے تو پھر اس سے ادھر ادھر نہ ہو اور متابعت یعنی پیروی کی صفت سے خروج نہ کرو۔

شان نزول کے مختلف قصے بیان کیے گئے ہیں۔ کہیں یہ کہ کسی شخص نے نماز عید سے پہلے قربانی کر دی تھی، کہیں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے باہم ایک جھگڑے کا قصہ ہے جو بخاری میں بھی ہے۔ اور یہ باتیں صحیح بھی ہوں تو عموم حکم میں شامل ہوں گی۔ اور مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام سے کسی قسم کی پیشقدمی نہ کی جائے۔ چونکہ اس سورت کا مضمون مسلمانوں کی باہم اخوت قائم کرنا ہے۔ اس لیے اس کی ابتدا اس سے کی ہے کہ سب کے سب اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کو سب باتوں پر مقدم کریں۔ کیونکہ **یہی اخوت اسلامی کی بنیاد ہے**۔ اور باہمی محبت جو اس سورت کا اصل مضمون ہے قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت سب محبتوں پر فائق نہ ہو۔ [لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ] (صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ، حديث: 15)

3118- ہر بات میں افراط و تفریط کے پہلو ہو جاتے ہیں اور اصلاح اسی کا نام ہے کہ کسی معاملہ میں افراط و تفریط ہر دو پہلوؤں سے روک کر میانہ روی پر قائم کیا جائے۔ مساوات بلاشبہ بہت اچھی چیز ہے اور ملک عرب میں مساوات موجود تھی، مگر اس کے ساتھ اگر **آداب مجلس** قائم نہ رہیں تو اخلاق کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے۔ یوں تو سب انسان برابر ہیں، لیکن اگر ایک سپاہی جرنیل کے سامنے ادب ملحوظ نہ رکھے اور اگر ایک شاگرد استاد کے سامنے سر جھکا کر نہ رکھے تو نہ وہ سپاہی وقت پر کام کر سکتا ہے، نہ وہ طالب علم علم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ﴿بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ بھی ہیں گو آپ سب انسانوں کے معلم بھی ہیں۔ پھر آپ ایک جرنیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے جن آداب کی ضرورت نظام کے قیام اور ترقی کے حصول کے لیے ہے وہ ضرور تھا کہ اس کامل تعلیم کا بھی حصہ ہوتے جو محمد رسول اللہ ﷺ لائے تھے۔ آپ کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ کوئی

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو رسول اللہ کے سامنے پست رکھتے ہیں وہی ہیں جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیئے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ (3119)

شخص آپ کے سامنے نیچی آواز سے گفتگو کرے اور نہ کسی کے اونچی آواز سے گفتگو کرنے سے آپ کا کچھ بگڑتا تھا۔ مگر نظام قومی اور ان لوگوں کی اپنی ترقی میں یہ امر حارج تھا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں اور اس آیت کے آخری حصہ میں صراحت بھی کر دی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نصائح بھی اپنے پاک کلام میں اتاریں۔ اور یہ خاص موقع بھی تھا اس لیے کہ پہلے لوگ تھوڑے تھوڑے دین اسلام میں داخل ہوتے اور ہجرت کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس آجاتے اور آپ کی صحبت میں رہ کر خود ہر قسم کے آداب سے واقف ہو جاتے تھے۔ لیکن جب ہر قسم کے لوگ کثرت سے اسلام کے اندر داخل ہونے لگے اور سب کو موقعہ بھی نہ ملتا تھا کہ زیادہ دیر آنحضرت ﷺ کے پاس ٹھہریں، تو ضروری ہوا کہ انہیں آداب مجلس سے بھی آگاہ کیا جائے۔ اور پہلے عام حکم کے بعد کہ کسی معاملہ میں بھی اللہ اور رسول سے تقدم اختیار نہ کیا جائے اور ان کے احکام سے آگے قدم نہ رکھا جائے، چند خاص باتوں کا ذکر کیا۔ یعنی ایک یہ کہ نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو۔ گویا آپ کے سامنے گفتگو میں طریق ادب اختیار کیا جائے اور دوسرے یہ کہ آپ کو اس طرح پکار کر آواز نہ دی جائے، جس طرح ایک دوسرے کو نام سے پکار کر آواز دی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جب آتے تھے تو آپ سے یا محمد کہہ کر ہی خطاب کیا کرتے تھے۔ اور بعض نے اول سے مراد لیا ہے کہ نبی سے بات کرتے وقت آواز کو آپ کی آواز سے اونچا نہ کرو اور دوسرے یہ کہ آپ جب خاموش ہوں اور گفتگو کرنے والا دوسرا ہو تو بہت بلند آواز سے گفتگو نہ کرے۔ اور یہ جو فرمایا: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾ تو مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ادب کے طریقوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بعض تمہارے اعمال بے کار ہو جائیں۔ کیونکہ جب آپؐ کی صحبت میں بیٹھ کر فیض حاصل نہ کیا تو یہ عمل ضائع ہو گیا۔ لیکن جو لوگ قدرتاً بلند آواز ہوں وہ اس میں شامل نہیں۔ جیسا کہ سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے کہ وہ رفیع الصوت تھے۔ تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ گھر میں بیٹھ گئے اور روتے تھے کہ یہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی، تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلوا بھیجا اور فرمایا کہ ''تُو تو اہل جنت میں سے ہے۔''

3119- ﴿امْتَحَنَ﴾ مَحْنٌ اور اِمْتِحَانٌ اِبْتِلَاءٌ کی طرح ہے۔ (غ) جس کے لیے [دیکھو نمبر: 155] اور حدیث میں اس شخص کے ذکر میں ہے جو اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے، یہاں تک کہ دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو ان سے جنگ کرتا ہے، یہاں تک کہ قتل کیا جاتا ہے: [فَذَلِكَ الشَّهِيدُ الْمُمْتَحَنُ فِي خَيْمَةِ اللهِ تَحْتَ عَرْشِهِ لَا يَفْضُلُهُ النَّبِيُّونَ إِلَّا بِدَرَجَةِ النُّبُوَّةِ] (سنن دارمی، کتاب الجهاد، باب: فِي صِفَةِ الْقَتْلٰى فِي سَبِيلِ اللهِ، حديث: 2466) جہاں مُمْتَحَنَ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

جولوگ تجھے حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ (3120)

کے معنی بھی صاف کیا گیا، پاکیزہ کیا گیا، خالص کیا گیا۔ کیونکہ [مَحْنَتُ الْفِضَّةُ] کے معنی ہیں چاندی کو آگ سے پاک اور خالص کیا۔ اور مجاہد سے ﴿امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ کے معنی مروی ہیں ان کے دلوں کو خالص کر دیا اور ابوعبیدہ نے اس کے معنی کیے ہیں انہیں مصفّٰی اور پاکیزہ (مہذب) بنایا۔ اور بعض نے ﴿امْتَحَنَ﴾ کے معنی شَرَحَ کیے ہیں یعنی ان کے دلوں کو کھول دیا۔ اور مَحْنٌ کے اصل معنی کوڑے سے مارنا ہیں اور اسم مِحْنَةٌ ہے۔ (ل)

اس سے معلوم ہوا کہ **آواز کے پست کرنے سے دل میں القاء پیدا ہوتا ہے**۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ اپنی آوازوں کو بلاضرورت بلند رکھتے ہیں وہ اخلاق فاضلہ سے محروم رہ جاتے ہیں، کیونکہ ان کو کسی موقعہ پر ادب ملحوظ نہیں رہتا۔ اور علاوہ ازیں ایسے لوگ علم کے حاصل کرنے میں بھی اکثر محروم رہ جاتے ہیں، کیونکہ گفتگو میں بلند آواز عموماً طبیعت میں ایک قسم کے انکار سے یا تکبر سے ہوتی ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کے وقت آواز کا بلند کرنا بھی موجب محرومی ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے ہر قسم کی آلائش سے پاک کر دیا تھا۔

3120- ﴿الْحُجُرٰتِ﴾ حُجْرَةٌ کی جمع ہے اور حُجْرَةٌ وہ ہے جس میں لوگ اترتے ہیں اور اس کے گرد احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور گھروں کے حجروں کو ان کے روکنے کی وجہ سے حجرے کہا جاتا ہے۔ (ل) یعنی ان کے گرد دیوار ہونے کی وجہ سے کوئی ان میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہاں مراد **نبی کریم ﷺ کی بیبیوں کے حجرے ہیں**۔ اور یہ کھجور کی ٹہنیوں کے بنے ہوئے تھے، جن کے دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں مسجد میں شامل کر دیئے گئے۔

جب دور دور سے لوگ آنے لگے تو انہیں **آنحضرت ﷺ کی مصروفیتوں کی خبر** نہ تھی۔ اس لیے بعض لوگ آتے ہی آنحضرت ﷺ کو یا محمد یا محمد کہہ کر پکارنے لگتے۔ ادھر آنحضرت ﷺ کی مصروفیتوں کو دیکھا جائے تو سمجھ نہیں آتا کہ آپ اکیلے اتنا کام کیونکر کر لیتے۔ ایک طرف آپ معلم قرآن ہیں تو دوسری طرف نمازوں کے امام ہیں۔ پھر اگر آپ بادشاہ وقت ہیں تو دوسری طرف ادنیٰ ادنیٰ کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ کہیں کسی کا سودا لا دیتے ہیں، کہیں کسی بی بی کو گھر کے کام میں مدد دیتے ہیں، کہیں بکری کا دودھ دوہ لیتے ہیں، کہیں اپنے کپڑے اور جوتے کی مرمت کر لیتے ہیں۔ پھر اگر آپ ﷺ کو ہی چاروں طرف مہمات ملکی کا فکر ہے، تو آپ کو خود ہی اتنی بڑی قوم کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہر ایک وفد آتا ہے کہ دین سیکھے۔ ادھر ایک فوجی مہم تیار کرنے کی ضرورت ہے، یہ سب کام آپ خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر ہر شخص اپنی ضرورت کو مقدم کرے تو کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے یہ طریق ادب سکھایا کہ جب دوسرے کاروبار اور حوائج ضروریہ سے فراغت ہوگی تو آپ خود باہر نکل آئیں گے۔ ہر شخص اگر آ کر آوازیں دینے لگے تو اس سے بڑے بڑے اہم کام رک جائیں گے۔ اس سب

وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تو ان کی طرف نکل آتا تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(3120)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تحقیق کرلیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے دکھ پہنچاؤ، پھر اس پر جو تم نے کیا پشیمان ہو۔(3121)

تعلیم کو آج بھی زندہ کیا جانے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک طرف مسلمانوں میں بڑے آدمی اور علماء اور سجادہ نشین اپنے آپ کو عوام الناس سے چھپ کر، الگ رکھ کر افراط کے مرتکب ہیں تو دوسری طرف اس تفریط کا سلسلہ بھی جاری ہے کہ ہر شخص اپنی بات کو اہم ترین قومی کاموں سے ضروری سمجھ کر یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس کا کام ہو جائے۔

3120(ل)- حَتّٰى جارہ ہے اور انتہا اور غایت میں اِلٰی کا کام دیتا ہے لیکن اس کا مجرور اس کا آخر ہوتا ہے یا آخری خبر سے ملنے والا۔ جیسے ﴿هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾[القدر: 5:97] ''یہ فجر کے طلوع تک۔'' اور ﴿حَتّٰى﴾ جب مضارع منصوب پر داخل ہوتا ہے تو تین معنوں میں ہوتا ہے۔ کبھی اِلٰی کے معنی میں جیسے ﴿حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱﴾[طٰہٰ: 91:20] ''جب تک کہ موسیٰ ہماری طرف لوٹ کر آئے۔'' کبھی کَیْ کی تعلیلیہ کے معنی میں ﴿وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ﴾[البقرة: 217:2] ''اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں لوٹا دیں۔'' کبھی اِلَّا کے معنی استثنا میں اور مضارع ﴿حَتّٰى﴾ کے بعد اسی وقت منصوب ہوتا ہے جب مستقبل کے معنی میں ہو اور کبھی ﴿حَتّٰى﴾ واؤ کی طرح عاطفہ ہوتا ہے۔

3121- ﴿فَتَبَيَّنُوْۤا﴾ تَبَيَّنُوْا۔ اَبَانَ۔ اِسْتَبَانَ اور تَبَيَّنَ لازمی اور متعدی دونوں طرح پر آتے ہیں۔[اِشْتَبَانَ الشَّيْءَ- تَبَيَّنَ الشَّيْءَ] کے معنی ہیں ظَهَرَ وہ چیز ظاہر ہوگئی۔ دیکھو[نمبر: 2800] اور اِسْتَبَنْتُهٗ اور بَيَّنْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے تحقیق کیا یا ظاہر کیا۔(ل)

﴿اَنْ﴾ کا استعمال چار طرح پر ہے۔

① ایک یہ کہ حرف مصدری ہو جو مضارع پر نصب دیتا ہے جیسے ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾[البقرة: 184:2] ''اور روزے رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔''

② دوم: اَنَّ سے مخفف اور یہ فعل یقین کے بعد آتا ہے جیسے ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى﴾[المزمل: 20:73] ''وہ جانتا

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَ

اور جان لو کہ تمہارے اندر اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو محبوب کر دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے

ہے کہ تم میں سے بیمار ہوں گے۔'' ﴿وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾[المآئدة: 71:5] ''اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی۔''

③ سوم: مفسرہ [دیکھو نمبر: 590]

④ چہارم: لَمَّا کے بعد تاکید کے لیے ﴿فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ﴾[یوسف: 96:12] ''پھر جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔'' ﴿وَ لَمَّاۤ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ﴾[العنکبوت: 33:29] ''اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے غمگین ہوا۔''

اور اِنْ بھی چار طرح پر آتا ہے۔ شرط کے لیے اور دونوں فعلوں کو جزم دیتا ہے۔ ﴿اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ﴾[الأنفال: 38:8] ''اگر وہ رک جائیں تو ان کو معاف کر دیا جائے گا۔'' اِنَّ سے مخفف اور اس کے ساتھ لام ضروری ہوتا ہے۔ ﴿اِنْ كَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا﴾[الفرقان: 42:25] ''قریب تھا کہ وہ ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا۔'' اور نافیہ جس کے لیے [دیکھو نمبر: 3022] اور حرف نفی کی تاکید کے لیے۔

خبروں کی تحقیقات:

حرث بن ابی ضرار خزاعی کا واقعہ احادیث میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں اپنی قوم کو اسلام کی طرف بلاؤں گا اور ان سے زکوٰۃ بھی وصول کروں گا۔ آپ اپنا عامل بھیج دیں جو مال زکوٰۃ لے آئے۔ جس شخص کو آپ نے بھیجا وہ رستہ سے واپس آ گیا اور کہا کہ زکوٰۃ دینے کی بجائے وہ مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے خالد یا کسی اور شخص کو ایک دستہ کے ساتھ اس کی طرف بھیجا اور بعد میں اصل واقعات کا اظہار ہوا۔ (ث) ایسے ایسے واقعات چونکہ پیش آتے رہتے تھے، اس لیے اس کے متعلق بھی نصیحت فرمائی۔ اور نَبَاءٌ چونکہ اہم خبر کو کہتے ہیں اس لیے فرمایا کہ اہم خبروں میں ایسے آدمیوں کا اعتبار نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوں خواہ وہ مسلمان ہی کہلاتے ہوں۔ بلکہ اگر غیر معتبر ذریعے سے خبر ملے تو پہلے تحقیق کر لو کہ صحیح بات کیا ہے۔ اور یوں گویا مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے کہ ہر خبر پر بغیر کافی وجہ اور بغیر تحقیقات کے اس قدر وثوق نہیں کر لینا چاہئے کہ اس کی بنا پر کسی قوم کو نقصان پہنچ جائے۔ ضروریات قومی کے ساتھ اصول، انصاف اور تحقیق کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکیلے آدمی کی شہادت بھی قابل قبول

الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾

اور کفر اور فسق اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ کر دیا ہے، یہی بھلائی کی راہ پر چلنے والے ہیں۔ (3122)

ہے، بشرطیکہ وہ فاسق نہ ہو۔ اس قسم کی ہدایات مسلمانوں کو باہمی فتنوں سے بچانے کے لیے تھیں۔

3122- ﴿اَنَّ﴾ اِنَّ دونوں تاکید کے لیے آتے ہیں اور اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں۔ اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ کے بعد جملہ مستقل ہوتا ہے اور اَنَّ کے بعد جو آتا ہے وہ مفرد کے حکم میں ہوتا ہے، جو کبھی مرفوع اور کبھی منصوب اور کبھی مجرور کے موقع پر ہوتا ہے۔ اور اِنَّ جب مَا سے مل جائے تو اس کے عمل کو باطل کرتا ہے۔ اور اس چیز کے لیے جس کا ذکر ہے اثبات حکم کرتا ہے۔ اور اس کے ماسوا اس کی نفی کرتا ہے یعنی حصر کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾[التوبة: 28:9] ''مشرک ضرور پلید ہیں۔'' اور یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ نجاست تامہ شرک سے مختص ہے ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ﴾[البقرة: 173:2] ''اس نے تم پر صرف مردار اور خون حرام کیا ہے۔'' گویا اسی کو حرام کیا ہے اور یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ سب سے بڑی حرام کی ہوئی چیزیں یہی ہیں۔ (غ)

﴿فِيْ﴾ فِيْ ظرفیت کے لیے آتا ہے۔ حقیقتاً ہو جیسے ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ﴾[الروم: 30:2-3] ''رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب سرزمین میں۔'' یا مجازاً جیسے ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾[النصر: 2:110] ''اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے۔'' اور کبھی مصاحبت کے لیے آتا ہے کبھی تعلیل کے لیے۔ جیسے [اَنَّ امْرَأَةً دَخَلَتِ النَّارَ فِي هِرَّةٍ] (مسند احمد، باب: مسند أَبِيْ هُرَيْرَة، حديث: 10864) یعنی بلی کی وجہ سے اور کبھی علی کے معنی میں جیسے ﴿لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ [طٰهٰ: 71:20] ''تمہیں کھجوروں کے تنوں میں صلیب دوں گا۔'' اور کبھی الیٰ کے معنی میں جیسے ﴿فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ [إبراهيم: 9:14] ''تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے۔'' اور کبھی مقایسہ کے لیے جیسے ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾﴾[التوبة: 38:9] ''سو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں تھوڑا ہی ہے۔'' یعنی آخرت پر قیاس کر کے اور فِيْ اسم بمعنی فم ہوتا ہے ﴿لِيَبْلُغَ فَاهُ﴾[الرعد: 14:13] ''تا کہ وہ اس کے منہ تک آ پہنچے۔'' یعنی منہ۔

﴿لَوْ﴾ ایک چیز کے امتناع کے لیے ہوتا ہے بوجہ کسی دوسری کے امتناع کے جیسے ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبيآء: 22:21] ''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوائے (کوئی اور) معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے۔'' اسی معنی میں ہے [لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ ابْنُ النَّبِيِّ ﷺ لَكَانَ صِدِّيقاً نَبِيًّا] (مسند احمد، باب: مسند أنس بن مالك، حديث: 12693) یعنی چونکہ اس کا نبی ہونا ممتنع تھا اس لیے وہ زندہ بھی نہ رہا۔ اور شرط کے معنی میں بھی آتا ہے [دیکھو نمبر: 32] اور لَوْلَا بھی دو طرح پر آتا ہے۔ کسی چیز کے امتناع کے لیے اور اس کے غیر کے واقع ہو جانے کی وجہ سے ﴿لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [السبأ: 31:34] ''اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔'' اور هَلَّا کے معنی میں ﴿لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا﴾[القصص: 47:28] ''کیوں تو نے ہماری طرف رسول نہ بھیجا؟'' (غ)

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۸

اللہ کی طرف سے فضل اور (اس کی) نعمت ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

﴿حَبَّبَ﴾ مَحَبَّةٌ اس چیز کا ارادہ ہے جسے تم اچھا سمجھو۔ پس ہر محبت ارادہ ہے، لیکن ہر ارادہ محبت نہیں۔ اور یہ تین طرح پر ہے۔ لذت کے لیے، نفع کے لیے، بزرگی کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے لیے اس کا اس پر انعام ہے اور انسان کی محبت اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے قرب کا طلب کرنا ہے۔ اور ﴿حَبَّبَ﴾ ایک چیز کو دوسرے کی طرف محبوب کر دیا۔ جیسے یہاں۔ (غ)

﴿الْعِصْيَانَ﴾ عَصَا کے لیے [دیکھو نمبر: 88] اور یہ عَصَوْتَ سے ہے یعنی واوی ہے اور [عَصِيَ عِصْيَانًا] جس کے معنی نافرمانی ہیں یائی ہے اور کبھی مجازاً ذلت یعنی معمولی لغزش پر بھی بولا جاتا ہے۔ (اقرب الموارد) اسی لحاظ سے فرمایا: ﴿وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ﴾ [طٰهٰ: 121:20] ''اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔'' کیونکہ دوسری جگہ خود فرمایا: ﴿فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝۱۱۵﴾ [طٰهٰ: 115:20] ''مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا عزم نہ پایا۔'' اور عَاصِيٌ اور عَصِيٌّ اس سے اسم فاعل ہیں۔ ﴿وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝۱۴﴾ [مریم: 14:19] ''اور سرکش نافرمان نہیں تھا۔''

صحابہؓ کا مقام محفوظیت:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی عصمت کو بیان فرمایا ہے یعنی وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ گناہ ان سے سرزد نہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں پر تعجب ہے جو انبیاء کی عصمت کو معرض بحث میں لاتے ہیں۔ یہاں نبی کے پیروؤں کے لیے مقام عصمت کا حاصل ہونا بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ رسول دوسرے لوگوں کی اطاعت نہیں کرتا کیونکہ وہ رضائے الٰہی کے راستوں پر چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے روشنی پاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ اسی لیے اس کے مقابل پر رسول کے پیروؤں کے رسول کی اطاعت کرنے کا ذکر کیا اور اطاعت کی بجائے لفظ ایمان اختیار کیا۔ کیونکہ اس میں فعل قلب اور اقرار لسان اور فعل جوارح تینوں شامل ہیں۔ اور پھر ایمان یا اطاعت رسول کا ان کے نزدیک محبوب ہونا بیان کیا اور جو چیز محبوب ہوتی ہے انسان اسے دوسرے پر ترجیح دیتا ہے اور اسی کا ارادہ کرتا ہے۔ گویا بتا دیا کہ صحابہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو دل سے بھی اچھا سمجھتے ہیں اور اسی کا ارادہ بھی کرتے ہیں۔ اور ﴿زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ میں بتایا کہ وہ اطاعت رسول ان کے قلوب میں گھر کر گئی ہے اور وہی ان کو خوبصورت اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گویا ان کے دل اس کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں اور پھر اس سے تین قسم کی ظلمتوں کی نفی کی۔ یعنی اگر وہ طاعات بجالاتے ہیں تو یہ نہیں کہ ان طاعات میں کسی قسم کی ظلمت کی ملونی ہو۔ سب سے بڑی ظلمت کفر ہے، اس سے اتر کر اور زبان سے اقرار کر کے، پھر انسان حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے جو فسق ہے، اس سے اتر کر معمولی نافرمانیاں ہیں۔ ان تمام ظلمتوں سے ان کا پاک ہونا ان الفاظ میں بیان کیا کہ ان کی طبیعت ان چیزوں سے کراہت کرتی ہے۔ اور جس چیز سے انسان کی طبیعت کراہت کرے اس کی طرف وہ کبھی عمداً قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اور یہ حکم ان کی اکثریت پر ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو تاریخ ایسا کوئی دوسرا پاک گروہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور یہ رسول اللہ ﷺ کی زبردست قوت

وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۹

اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرادو۔ پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرادو اور انصاف کرو، کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (3123)

قدسی کا ثبوت ہے۔ اہل تشیع اور عیسائیوں کے اعتراضات کا اس آیت میں جواب ہے۔ اور صحابہ میں جو باہم اختلاف ہوئے، تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی وجہ بھی ان کی زبردست قوت ایمانی تھی جس بات کو سچا سمجھا اس کے مقابل کسی کی پروا نہیں کی۔

3123- **دو مسلمان گروہوں کی جنگ میں جماعت اسلامی کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے:** بخاری اور مسلم وغیرھما میں ہے کہ عبداللہ بن ابی نے کچھ کلمات آنحضرت ﷺ کی تحقیر کے لیے بولے جس پر بعض صحابہ اور اس کے ساتھیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ابن جریر نے ایک انصاری اور اس کی بی بی کے متعلقین کے جھگڑے کے قصے میں اس کا نزول بیان کیا ہے۔ لیکن آیت مسلمانوں کی عام ہدایت کے لیے ہے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور کسی خاص واقعہ سے اسے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے منافقوں کے گروہ کے لیے مومن کا لفظ نہیں آسکتا اور فی الحقیقت یہی اس سورت کی اصل غرض ہے کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ وہ سب باہم بھائی بھائی ہیں۔ پس اگر مقاتلہ تک بھی ان میں نوبت پہنچ جائے تو پھر بھی ان میں مصالحت کی کوشش ہی کرنی چاہئے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ البتہ باہم جنگ وجدال میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غلطی پر کون فریق ہے اور زیادتی کس کی ہے۔ پس اگر زیادتی کرنے والا فریق اپنی زیادتی سے باز نہ آئے تو جماعت اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس کی اعانت کرے جس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ مسلمانوں نے اس طریق عمل کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور آج کل جو صلح کل لوگ ہیں وہ مصالحت اسے قرار نہیں دیتے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ بلکہ مصالحت ان کے نزدیک یہ ہے کہ منہ سے اتنا کہہ چھوڑیں کہ ہم دونوں کو برا نہیں کہتے۔ جب زیادتی کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ مقاتلہ تک کو ضروری ٹھہراتا ہے اور مصالحت کے لیے صحیح طریق عمل اسی کو قرار دیتا ہے تو آج ہمارا کوئی اور طریق تجویز کرنا قرآن کے اس صریح حکم سے سرتابی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا باہمی تفرقہ روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

باغی کافر نہیں:

یہاں پر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم دونوں گروہوں کو مومن قرار دیتا ہے۔ گو جنگ تک بھی ان کی نوبت پہنچ چکی ہو۔ پس وہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ع ﴿۱۰﴾

ع 1 10 13 النصف

مومن بھائی بھائی ہی ہیں۔سو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (ایک) قوم (دوسری) قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں (دوسری) عورتوں پر (ہنسیں) شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو۔ایمان کے بعد برا نام کیا ہی برا ہے۔اور جو

لوگ جو ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر اپنے مسلمان بھائیوں کو کافر قرار دیتے ہیں اس حکیمانہ تعلیم سے کتنی دور پڑے ہوئے ہیں۔خوارج کا باغی علی الامام کو یا اہل تشیع کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں کو کافر قرار دینا اس تعلیم قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

صحابہؓ کی باہمی جنگ:

صحابہ میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ اس آیت کے ماتحت آتی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے دونوں جنگ کرنے والے گروہوں کو مومن قرار دیا ہے،خواہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا گروہ ہو،خواہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس جنگ میں حصہ لینا محض مصالحت کی غرض سے تھا۔ان کی غرض سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو سزا دینا تھا،اور یہ آپ کے بیانات سے ظاہر ہے جو تاریخ نویسوں نے نقل کیے ہیں۔مثلاً ایک موقعہ پر انہوں نے والیٔ بصرہ کے دو ایلچیوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اور انہی سے اصل بنائے فساد پیدا ہوئی تھی۔''واقعہ یہ ہے کہ آوارہ گردان قبائل نے مدینہ پر جو محترم تھا حملہ کیا اور وہاں فتنے برپا کیے۔انہوں نے بے گناہ خلیفہ اسلامی کو قتل کیا،معصوم خون کو حلال جان کر بہایا،جس مال کا لینا ان کو جائز نہ تھا وہ لوٹا۔حرم محترم نبوی کی بے عزتی کی،ماہ مقدس کی توہین کی،لوگوں کی آبروریزی کی،مسلمانوں کو بے گناہ مار پیٹ کی۔''اور آخر کار فرمایا کہ میں انہی امور کی اصلاح کے لیے نکلی ہوں یعنی جب ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو زیادتی کرنے والے گروہ کو سزا دینا ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب جنگ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ناکامی ہوئی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ انہیں مدینہ بھیجا،کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی بغرض اصلاح ہی نکلی ہیں۔اور اسی طرح سیدنا زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے قاتلوں پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اظہار ناراضگی فرمایا۔

الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑪ توبہ نہ کرے تو وہی ظالم ہیں۔(3124)

3124- ﴿نِسَآءٌ﴾ اور نِسْوَانٌ اور نِسْوَةٌ تینوں مَرْأَةٌ کی جمع ہیں یعنی عورتیں اور یہ جمع غیر لفظ سے ہے جیسے مَرْءٌ کی جمع قَوْمٌ ہے۔ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ﴾[الأحزاب: 32:33] ''اے نبی کی عورتو!'' ﴿قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ﴾[يوسف: 30:12] ''شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا۔'' (غ)

﴿تَلْمِزُوْٓا﴾ لَمْزٌ کے معنی[نمبر: 1308] میں مفردات راغب سے بیان کیے گئے ہیں۔لیکن لسان العرب میں ہے کہ اَلْمَزُ عَمْزٌ کی طرح منہ پر یعنی سامنے ہوتا ہے مگر خفی کلام کے ساتھ اور ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ﴾[التوبة: 58:9] ''جو زکوٰۃ (کے بانٹنے) میں تجھے طعنہ دیتے ہیں۔'' میں معنی کیے گئے ہیں [يُحَرِّكُ وَشَفَتَيْهِ] یعنی اپنے ہونٹ ہلاتا ہے اور لُمَزَةٍ اور هُمَزَةٍ میں یہ فرق کیا ہے کہ لُمَزَةٍ منہ پر عیب لگانے والا اور هُمَزَةٍ پیٹھ کے پیچھے۔اور لکھا ہے کہ اس کا اصل یہ ہے کہ آنکھ اور سر اور ہونٹ کے ساتھ اشارہ کیا جائے یعنی کلام خفی سے ملا ہوا۔اور وہ معنی بھی آئے ہیں جو مفردات سے نقل کیے گئے ہیں یعنی پیٹھ کے پیچھے عیب لگانا۔اور ابن کثیر نے یہ تفریق کی ہے کہ هَمْزٌ فعل سے ہے اور لَمْزٌ قول سے۔

﴿تَنَابَزُوْا﴾ نَبَزٌ کے معنی نقب یا نام ہیں اور بز مصدر ہے یعنی نام رکھنا اور تَنَابُزٌ ایک دوسرے کے نام رکھنا۔اور اکثر استعمال اس کا ذم کے موقع پر ہے۔ثعلب کا قول ہے یہودی یا نصرانی کو [يَا يَهُوْدِيّ] اور [يَا نَصْرَانِيّ] کہہ کر پکارتے تھے،اس سے روکا ہے۔یہوی یا نصرانی مسلمان ہو جائے تو اسے یہودی یا نصرانی کہنے سے روکا ہے اور الفاظ ﴿بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ دوسرے معنی کی تائید کرتے ہیں۔(ل)

﴿بِالْاَلْقَابِ﴾ اَلْقَابِ۔ لَقَبٌ کی جمع ہے اور وہ انسان کا ایسا نام ہے جو پہلے نام کے سوا ہو اور اس میں معنی کا لحاظ ہوتا ہے برخلاف اعلام یعنی انسان کے اسم معرفہ کے اور لقب عزت کے طور پر بھی ہوتا ہے، جیسے بادشاہوں کے القاب اور نَبَزٌ اور ذَمٌّ کے طور پر بھی۔(غ)

دوسروں کی تحقیر سے بچنے کی نصیحت:

آیت کے پہلے حصہ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔بنی تمیم کے کچھ لوگوں نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ پر ہنسی کی تھی یا سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کچھ کہا تھا یا عکرمہ بن ابی جہل کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ یہ اس امت کے فرعون کا بیٹا ہے۔اور دوسرے حصہ کے متعلق ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کو مسجد میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ فلاں عورت کا بیٹا ہے جس سے عیب لگانا مقصود تھا تو آیت نازل ہوئی تو انہوں نے توبہ کی۔ایک روایت کی رو سے بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا کہ یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی کہ ہم میں سے ایک ایک شخص کے دو دو، تین تین نام پڑے ہوئے تھے۔اصل غرض تو جماعت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان (بد) کرنے سے بچو، کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔ اور نہ ایک دوسرے کے بھید ٹٹولو اور نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا کہو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ تو تم اس سے کراہت کرتے ہو اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ رجوع برحمت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (3125)

اسلام میں محبت ومؤدت کے تعلقات پیدا کرنا ہے۔ اس لیے جب یہ ذکر کیا کہ مسلمانوں میں باہمی مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے تو ساتھ ہی ان موجبات کو بھی دور کرنے کی تعلیم دی جن سے باہم تنافر، تحاسد پیدا ہوتا اور بعض وقت لڑائیوں تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ اور یہاں تین باتوں سے روکا ہے۔ اول: دوسروں پر تمسخر کرنا، دوسرا: ان کے منہ پر عیب لگانا، تیسرا: ان کے نام رکھنا۔ ان تینوں میں دوسرے کی تحقیر اس کے منہ پر ہے۔ ﴿لَا يَسْخَرْ﴾ میں تو اس بات سے روکا ہے کہ اس کی تحقیر کے لیے اس پر ہنسی کرے اور ﴿لَا تَلْمِزُوْٓا﴾ میں اس سے کہ سر یا آنکھ یا ہونٹوں کے اشارہ اور کلام خفی سے اس کی تحقیر کرے۔ اور ﴿لَا تَنَابَزُوْا﴾ میں اس سے کہ اس کے نام رکھے۔ اور یہ تینوں باتیں عموماً دوسروں کے سامنے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگلی آیت میں ان باتوں کا ذکر ہے جو عموماً پیٹھ پیچھے ہوتی ہیں اور ﴿تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ میں ہر قسم کے نام رکھنا منع کیا ہے۔ مثلاً کسی کا ایسا نام رکھنا جسے وہ ناپسند کرے یا کسی کو یہودی یا نصرانی کہنا یا کسی کو فاسق یا منافق کہنا۔ اور بالخصوص یہ دوسری باتیں مراد ہیں، جیسا کہ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ﴾ سے ظاہر ہے۔ یعنی ایک شخص جو ایمان لا چکا ہے اس کا نام یہودی یا نصرانی یا فاسق یا منافق رکھنا بہت برا کام ہے۔ اور عورتوں کو یہاں بالخصوص خطاب کیا ہے۔ کیونکہ یہ بیماری عورتوں میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔

3125- ﴿تَجَسَّسُوْا﴾ جَسّ سے ہے اور وہ اصل میں رگ کا چھونا ہے تاکہ صحت یا بیماری کا حکم لگانے کے لیے نبض کا حال دیکھا جائے اور وہ حَسّ سے زیادہ خاص ہے۔ کیونکہ حَسّ اس چیز کا جاننا ہے جس کا ادراک جَسّ سے ہو۔ اور جَسّ ہر قسم کے حال کا جاننا ہے اور لفظ جاسوس اسی سے ہے۔ (غ) اور تجسس دوسرے کے بھید کی تلاش کرنا اور اس کا اطلاق غالباً شر میں ہوتا ہے اور تجسس کا خیر میں۔ (ث) اور جَاسُوْس صاحب سِرّ شر ہے اور نَامُوْس صاحب سِرّ خیر۔ اور حدیث میں جَسَّاسَۃ سمندر کے جزائر کا ایک دابّہ ہے جو خبریں تلاش کر کے دجال کو پہنچائے گا۔ (ل) اور دابہ سے مراد یہاں زمین پر جھکا ہوا انسان ہے۔

﴿يَغْتَبْ﴾ غِيْبَةٌ یہ ہے کہ انسان دوسرے کے عیبوں کا ذکر کرے بغیر اس کے کہ اس ذکر کی ضرورت ہو۔ (غ) اسی سے اِغْتِيَابٌ ہے اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ غیب یہ ہے کہ تم اس بات کا ذکر اپنے بھائی کے متعلق کرو جسے وہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے پرہیز گار ہے۔ اللہ جاننے والا خبردار ہے۔ (3126)

ناپسند کرتا ہے۔ [ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآدب، باب: تَحْرِيمِ الْغِيبَةِ، حديث: 6758) اور جب دریافت کیا گیا کہ اگر وہ بات جو کہی جاتی ہے میرے بھائی میں پائی جاتی ہو؟ فرمایا: یہی غیبت ہے اور اگر نہ پائی جاتی ہو تو یہ بہتان ہے۔ (ث)

﴿لَحْمَ﴾ گوشت کو کہتے ہیں۔ جمع لحوم ہے۔ ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا﴾ [الحج: 37:22] ''نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں۔''

یہاں تین اور باتوں کا ذکر ہے جن سے جماعت میں نقصان پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بات ظن ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر تمہارے بھائی کے منہ سے کوئی بات نکلے تو جب تک اسے اچھے معنی پر حمل کر سکتے ہو کرو اور ایک حدیث میں ہے: [إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ] (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب: لاَ يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ، حَتَّى يَنْكِحَ أَوْ يَدَعَ، حديث: 5143) ظن سے بچو، ظن سب سے جھوٹی بات ہے۔ (ث) اور اصول یہی ہے کہ جب تک ایک بات یا فعل نیکی پر محمول ہو سکتا ہے اسے بدی پر محمول نہ کیا جائے۔ ﴿بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ میں بتایا کہ گو بعض وقت بدگمانی صحیح بھی ہو مگر ہمیں ضرورت نہیں کہ بدگمانی میں پڑیں۔ اس لیے کہ شاید وہ غلط ہی ہو اور گناہ ہو جائے۔ اور دوسری بات جس سے روکا ہے لوگوں کے احوال کا تجسس کرنا ہے۔ ابوداؤد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی عورات (یعنی پردے کی باتوں) کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔ جو ایسا کرتا ہے اللہ اسے رسوا کرتا ہے۔ (ر)

تیسری بات جس سے منع کیا ہے غیبت ہے۔ یعنی پیٹھ پیچھے کسی کے عیبوں کا ذکر کرنا اور اسے مردہ بھائی کے گوشت کے کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ عیب یا کمزوری ایک مردہ گوشت کے حکم میں ہے۔ لیکن حصول علم کے لیے لوگوں کے احوال کا تلاش کرنا یا کسی کے اس عیب کا بیان کرنا جس کا اثر اس علم پر پڑتا ہے جیسے راویوں کا کذب وغیرہ، یہ ایک ضرورت کے لیے ہے۔ غیبت وہ ہے جو بلا ضرورت ہو، جیسا کہ راغب نے لکھا ہے۔

3126- ﴿شُعُوْبًا﴾ شُعُوْبٌ۔ شَعْبٌ اکٹھا کرنا اور الگ الگ کرنا اور اصلاح کرنا اور بگاڑنا ہے، یعنی اضداد میں سے ہے۔ اور شُعْبٌ بڑے قبیلہ کو کہتے ہیں جس کی جمع شُعُوْبٌ ہے۔ یعنی سب سے بڑا شُعْبٌ ہے، پھر قَبِيْلَةٌ، پھر عِمَارَةٌ، پھر بَطْنٌ، پھر فَخِذٌ، پھر فَصِيْلَةٌ اور یہ گویا انسان کے سر کی طرف سے نیچے کی طرف اعضا کے ناموں پر ہیں۔ (ل)

تقویٰ عزت کا معیار ہے:

ان ہدایات کے بعد ایک اصل بتایا کہ ایک دوسرے کی تحقیر یا عیب شماری وغیرہ جو کی جاتی ہے اس لیے کہ ایک شخص اپنے آپ کو

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

دیہاتی کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہہ، تم ایمان نہیں لائے لیکن کہو ہم مسلمان ہوئے اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو تمہارے عملوں میں سے تمہیں کچھ کم کر کے نہیں دے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (3127)

بڑا معزز خیال کرتا ہے۔ تو فرمایا کہ بڑا اور معزز اللہ کے نزدیک وہی ہے جو متقی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو نگاہ رکھنے والا۔ اور کوئی بڑائی چھوٹائی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں رکھتی، بلکہ یہ جو مختلف قومیں اور قبیلے ہیں تو ان کی اصل غرض یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں۔ گویا یہ تقسیم انسانوں کی محض شناخت کے لیے ہے نہ بڑائی چھوٹائی پیدا کرنے والی۔ اسلام کی تعلیم کا یہ اصول ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾[13] ایک ایسی بنیاد اخوت کی رکھتا ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اصول نہیں کر سکتا۔ یعنی تمام قومی تفریقات و امتیازات کو یکسر مٹا دیا ہے جن کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر فخر ہی نہیں بلکہ ظلم اور زیادتی بھی کر لیتے ہیں۔ اور کالے اور گورے کے سب جھگڑوں کو یکسر مٹا دیا۔ آج دنیا جن مصائب میں سفید اور سیاہ کی تفریق سے پڑ رہی ہے ان کا کوئی علاج سوائے اسلام کے نہیں۔ اور بیہقی کی ایک روایت میں حجۃ الوداع کے خطبے میں یہ لفظ آتے ہیں: [يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ] (شُعَبُ الْإِيمَانِ لِلْبَيْهَقِيِّ، باب: حفظ اللسان عما لا يحتاج اليه، فصل؛ ومما يجب حفظ اللسان منه، حديث: 4774) (ر) یعنی ''اے لوگو! تمہارا ربّ ایک ہی ہے۔ پس عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے **سوائے تقویٰ** کے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی سب سے بڑھ کر عزت والا ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے۔'' اور اس آیت کے شان نزول میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنی بیاض کو حکم دیا تھا کہ ابو ہند سے اپنی ایک عورت کی شادی کر دیں۔ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم اپنے موالی سے شادی کر دیں۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور آنحضرت ﷺ نے خود سیدہ زینب رضی اللہ عنہا جیسی اعلیٰ خاندان کی عورت کی شادی زید رضی اللہ عنہ ایسے ایک آزاد شدہ غلام سے کی۔ اور آنحضرت ﷺ کا نسب قطع نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سیّد اگر کوئی برا کام کرے یا مرتد ہو جائے تو وہ بھی قابل عزت ہے۔ عزت بہر حال تقویٰ سے ہی ہے۔

3127- ظاہر ہے کہ یہ خاص لوگوں کا ذکر ہے۔ مجاہد کہتے ہیں بنی اسد بن خزیمہ کا ذکر ہے جنہوں نے اسلام ظاہر کیا تھا مگر ان کے دلوں میں کھوٹ تھا۔ وہ صرف مغانم اور دنیا کے مال کے خواہش مند تھے۔ اور بعض کے نزدیک مزینہ، جہینہ، اسلم، شجاع وغیرہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮

مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پھر کچھ شک نہیں کرتے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ یہی سچے ہیں۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑯

کہہ، کیا تم اللہ کو اپنا دین جتاتے ہو اور اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

قبیلوں کا ذکر ہے۔ بہرحال عام طور پر اعراب کا ذکر نہیں۔ دوسری جگہ ہے ﴿وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ [التوبة: 99:9] ''اور بعض گاؤں والے ایسے بھی ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں۔'' اور ﴿اَسْلَمْنَا﴾ سے یہاں مراد صرف ظاہری طور پر فرمانبرداری کر لینا ہے۔ لیکن یہ الفاظ لا کر بتا دیا کہ دائرہ اسلام میں وہ بھی داخل ہیں اور جماعت اسلامی کا حصہ ہیں، انہیں اسلام سے خارج قرار نہیں دیا۔ بلکہ آخر پر ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ لا کر مسلمانوں کو یہی ہدایت کی ہے کہ ان سے نرمی کا معاملہ کریں اور برائے نام مسلمانوں کو بھی مسلمان اور اپنے بھائی ہی سمجھیں۔ ہاں ان کی کمزوریوں کا ذکر کر کے اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ اور اگلی آیت میں بتایا کہ مومن کے نام کے مستحق ہونا چاہتے ہو تو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کر کے دکھاؤ۔ یوں **مومن اور مسلم میں ایک فرق** رکھا ہے۔ یعنی مسلم تو ہر وہ شخص ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا، خواہ ابھی اسلام کے احکام پر پورے طور پر عامل ہے یا نہیں اور خواہ دل میں وساوس بھی پیدا ہوتے ہوں۔ اور مومن وہ ہے جس کا نہ صرف دل ہر قسم کے وساوس سے پاک ہے بلکہ جو بلحاظ عمل بھی اس بلند مرتبہ پر پہنچ چکا ہے کہ اس کی ساری طاقت اور اس کا مال و دولت اعلائے کلمۃ اللہ میں صرف ہوتے ہیں۔ اور یہاں **ایمان کامل یعنی اس کے تینوں پہلوؤں کا ذکر ہے۔**

① اول: اقرار لسانی ﴿اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ ② دوم: تصدیق قلبی ﴿ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾

③ سوم: عمل بالجوارح ﴿وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

جو لوگ اپنے بھائیوں پر ذرا ذرا کمزوریاں دیکھ کر کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں، ان کے لیے یہ مقام محل غور ہے کہ قرآن کریم

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

تجھ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے۔ کہہ، مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو بلکہ اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ایمان کی راہ دکھائی۔ اگر تم سچے ہو۔ (3128)

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع 2 8 14

اللہ آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہے اور اللہ اسے دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔

کس صراحت سے ان لوگوں کو مسلم قرار دیتا ہے، جن کے متعلق خود ہی فرماتا ہے کہ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ آج اس معیار پر کتنے مسلمان پورے اترتے ہیں اور کتنے ان اعراب کے ذیل میں آتے ہیں۔ جو صرف نام کے مسلمان کہلوا کر اسلام پر احسان جتاتے ہیں۔

3128- بنی اسد بن خزیمہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ ہم بوجھوں اور عیال کے ساتھ آپ کے پاس آئے ہیں اور ہم نے آپ کے ساتھ جنگ نہیں کی جیسا کہ فلاں قبیلہ نے کی ہے، تو گویا یہ احسان جتانا تھا۔ تو فرمایا کہ احسان تو اللہ کا تم پر ہے کہ تمہیں ایمان کا رستہ دکھا دیا۔ آج جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے لیے ایک تنکا بھی نہیں اٹھاتے وہ بھی عملی طور پر گویا اسلام پر احسان جتاتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو اللہ کے رستے میں کچھ کام کر کے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں نے فلاں بڑا کام کیا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو کسی خدمت دینی کی توفیق ملتی ہے تو وہ اسے بہت بڑی چیز سمجھ کر خدا کے دین یا اس کے رسول پر احسان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا فرض تھا جو انہوں نے ادا کیا۔

آیَاتُهَا 45 (50) سُوْرَۃُ قٓ مَکِّیَّۃٌ (34) رُکُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

المنزل 7

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ ①

(اللہ تعالیٰ سب باتوں پر) قادر ہے،[3129] بزرگی والا قرآن گواہ ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۚ ②

بلکہ یہ تعجب کرتے ہیں کہ ان کے پاس ان میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔ سو کافر کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے۔

سورۃ ق

نام:

اس سورت کا نام قٓ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 45 آیتیں ہیں۔ قٓ مقطعات قرآنی میں سے ہے اور مراد اس سے اللہ تعالیٰ کا اسم قادر یا قدیر ہے۔ اور اس سورت میں یہی دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ سے ایک انقلاب عظیم پیدا کردے گا اور اس کے ساتھ ہی قیامت کا ذکر بھی ہے۔ اور دونوں باتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف ہی توجہ دلائی ہے۔ اور ترتیب کے لحاظ سے پچھلی سورتوں سے تعلق ظاہر ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفتح میں دین اسلام کے کل دینوں پر غلبہ کا ذکر تھا اور سورۃ الحجرات اسی کے ایک حصہ کی تفسیر تھی۔ پس اس سورت کو ساتھ رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس غلبہ کے لانے پر قادر ہے اور کہ یہ غلبہ بذریعہ قرآن کریم ہوگا۔ اسی لیے قرآن کی صفت مجید کا سب سے پہلے یہاں ذکر کیا ہے۔ اور یہ سورت مکی ہے اور اس کا نزول غالباً ابتدائی مکی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

3129- ﴿قٓ﴾ ابن جریر میں تین قول لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ قرآن کے اسماء میں سے ہے۔ زمین کے اردگرد ایک پہاڑ ہے۔ مگر اس تیسری بات کو تو سیاق سے کوئی تعلق نہیں اور روح المعانی میں ایک قول نقل کیا ہے کہ جبل قاف کا (جس کے بہت طول طویل قصے بنائے گئے ہیں) کوئی وجود نہیں اور پہلا قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور وہی صحیح ہے۔

﴿الْمَجِيْدِ﴾ مَجْدٌ کرم اور جلال کی وسعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں بھی ﴿الْمَجِيْدِ﴾ ہے یعنی وہ عطائے فضل ہیں جو اس سے خاص ہے، وسعت والا ہے۔ اور قرآن کا وصف بھی ہے، بہ سبب کثرت اس کے جو مکارم دنیوی اور اخروی سے اس میں

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو اٹھائے جائیں گے) یہ لوٹ کر آنا دور (از قیاس) ہے۔ (3130)

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴

ہم جانتے ہیں جو زمین ان سے کم کر دیتی ہے اور ہمارے پاس حفاظت کرنے والی کتاب ہے۔ (3131)

ہیں۔ (غ)

﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ﴾ کی ترکیب ایسی ہی ہے جیسے ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۘ﴾ [صٓ: 1:38] ''اللہ صادق ہے بزرگی دینے والا قرآن گواہ ہے۔'' کی۔ اور جواب قسم گو قٓ میں آ گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے جس کا کافر انکار کرتے ہیں۔ یعنی قیامت کا آنا یا آنحضرت ﷺ کا روحانی قیامت قائم کرنا اور اس پر گواہ خود قرآن مجید کو بنایا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں مجد پیدا ہوگی اور اس کے متبعین کو مکارم دنیوی اور اخروی سے حصہ کثیر دیا جائے گا۔ اور قرآن شریف میں قیامت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس روحانی قیامت کا ذکر بھی چلتا ہے جس کی طرف [يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي] (صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب: مَا جَاءَ فِي أَسْمَاءِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، حديث: 3532) میں اشارہ ہے۔

3130- ﴿بَعِيْدٌ﴾ بَعِدَ کے لیے [دیکھو نمبر: 1477] ﴿فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝﴾ [السبأ: 8:34] ''وہ عذاب میں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔'' میں بَعِيْدٌ سے مراد گمراہی میں ایسی دوری ہے جس سے لوٹ کر ہدایت کی طرف آنا سخت دشوار ہے۔ اور ﴿مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝﴾ [هود: 89:11] ''اور لوط کی قوم بھی تم سے دور نہیں۔'' میں گمراہی میں مقاربت ہے۔ (غ) اور یہاں بَعِيْدٌ سے مراد بعید از مکان یا بعید از عادت ہے۔ (ر)

3131- ﴿تَنْقُصُ﴾ نَقْصٌ حظ میں کمی کرنا ہے اور مَنْقُوْصٌ کم کیا گیا۔ ﴿نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ [البقرة: 155:2] ''مالوں میں کمی سے۔'' ﴿غَيْرَ مَنْقُوْصٍ﴾ [هود: 109:11] ''بغیر کم کیے۔'' (غ)

﴿كِتٰبٌ حَفِيْظٌ﴾ سے مراد حفاظت کرنے والی کتاب ہے۔ [كِتَابٌ حَافِظٌ تَفْصِيْلَ الْاَشْيَاءَ] (ر) مگر جس چیز کی حفاظت کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ اعمال انسانی ہیں۔ کیونکہ انہی کی حفاظت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے جیسے: ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [الانفطار: 11:82-12] ''معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔'' ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝﴾ [قٓ: 18:50] ''وہ کوئی بات نہیں بولتا، مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے۔'' ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد: 11:13] ''اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔''

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵

بلکہ انہوں نے حق کو جھٹلا دیا، جب وہ ان کے پاس آیا۔ سو وہ الجھن کی حالت میں ہیں۔ (3132)

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶

تو کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے ہم نے اسے کس طرح بنایا اور اسے زینت دی اور اس میں کوئی خلل نہیں۔ (3133)

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷

اور زمین کو ہمیں نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈالے اور اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائیں۔

تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸

ہر ایک رجوع کرنے والے بندے کو سمجھانے اور یاد دلانے کو۔

دوسری پیدائش اعمال سے ہے:

پس ان کے اس اعتراض کے مقابل پر کہ ہم مٹی ہو جائیں گے فرمایا ہے کہ جس چیز کو زمین کم کر دے گی اسے بھی ہم جانتے ہیں یعنی وہ جسم انسانی ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو ان چیزوں کو محفوظ کر لیتی ہے جو محفوظ کرنے کے قابل ہیں یعنی اعمال انسانی کو اس لیے کہ جسم میں تو یہاں بھی ہر آن ایک تغیر رہتا ہے۔ لیکن اعمال کے نتائج ساتھ ساتھ پیدا ہوتے جاتے ہیں اور کوئی عمل بے فائدہ نہیں ہوتا۔

3132- ﴿مَّرِيْجٍ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2386] مراد یہ ہے کہ ایک رائے قائم نہیں کر سکتے۔ کبھی سحر کہتے ہیں، کبھی کہانت وغیرہ۔

3133- **آسمان میں فروج نہ ہونے سے مراد:** ﴿فُرُوْجٍ﴾ [دیکھو نمبر: 2252] وَالْمُرَادُ سَلَامَتُهَا مِنْ كُلِّ عَيْبٍ وَ خَلَلٍ۔ (ر) مراد اس سے ہر عیب اور خلل سے سلامت ہونا ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳﴾ [الملك: 3:67] ''جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا، تو رحمن کی پیدائش میں کوئی اختلاف نہ دیکھے گا۔ پھر نظر کو لوٹا، کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے۔'' جہاں آسمانوں کے ذکر میں ہی فرمایا ہے کہ نہ ان میں تفاوت ہے نہ اختلال۔ یعنی ایک ہی قانون کے ماتحت سب نظام چل رہا ہے۔ یہی منشا یہاں فروج کے نہ ہونے سے ہے یعنی قانون الٰہی میں کوئی فرق اور اختلال نہیں۔

وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴿۹﴾

اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغ اگائے اور دانہ جو کاٹا جاتا ہے۔

وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴿۱۰﴾

اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھہ تہ بتہ ہے۔ (3134)

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

بندوں کے لیے رزق (ہے) اور اس کے ساتھ ہم مردہ بستی کو زندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نکلنا ہوگا۔ (3135)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۙ﴿۱۲﴾

ان سے پہلے بھی جھٹلایا نوح کی قوم نے اور کنویں والوں نے اور ثمود نے۔

وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ﴿۱۳﴾

اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے۔

وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

اور بن کے رہنے والے اور تُبّع کی قوم نے، سب نے رسولوں کو جھٹلایا۔ سو میرا (عذاب کا) وعدہ سچا ہوا۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ ع 1 15 15

تو کیا ہم پہلی پیدائش میں تھک گئے؟ بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔ (3136)

3134- ﴿بٰسِقٰتٍ﴾ [بٰسِقٌ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِهٖ] یعنی ان پر علو حاصل کیا اور بَاسِقٌ وہ ہے جو اونچائی میں لمبا ہو جائے۔ (غ)

3135- [دیکھو نمبر: 2585] اس کے اندر دونوں مفہوم شامل ہیں۔ قیامت میں مردوں کا زندہ کرنا، روحانی زندگی کا عطا کرنا۔ جس طرح آسمانی بارش سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، اسی طرح وحی کی بارش سے روحانی مردے زندہ ہو جاتے ہیں اور یہ قیامت کا ثبوت ہے۔

3136- مطلب یہ ہے کہ پہلی پیدائش جو نیستی سے ہستی کرنا تھا اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ عاجز نہیں آئی تو نئی پیدائش کے متعلق یہ شبہات کہ یہ کس طرح ہوگا؟ صحیح نہیں۔ یہاں اس **دوسری پیدائش** کو خلق جدید کہہ کر صاف بتا دیا کہ یہی جسم پھر نہیں بنے گا۔ بلکہ وہ ایک نئی پیدائش ہوگی اور وہ جسم جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اعمال انسانی سے تیار ہوگا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو اس کا نفس وسوسہ ڈالتا ہے اور ہم اس سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (3137)

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾

جب دو لینے والے لیتے جاتے ہیں (وہ) دائیں اور بائیں بیٹھے ہوتے ہیں۔ (3138)

3137- ﴿حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ حَبْل ہر ذریعہ کو کہتے ہیں۔[نمبر: 490] اور یہاں مراد رگ ہے اور وَرِيْدٌ وہ رگ ہے جو جگر اور دل سے ملتی ہے اور اس میں خون اور روح (حیوانی) کے مجاری ہیں۔ (غ) پہلے رکوع میں آسمان زمین وغیرہ کی پیدائش کا ذکر کیا تو اس میں انسان کی پیدائش اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعمال کی حفاظت کا ذکر کیا ہے، جس کی طرف ﴿كِتٰبٌ حَفِيْظٌ﴾[4] میں اشارہ کیا تھا۔ پہلے اپنے علم کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف انسان کے اعمال کا ہی علم ہے بلکہ ان برے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور برے خیالات کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا کہ شریروں کی سزا کا ذکر خصوصیت سے آگے کیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق فطرت انسانی ہے وہی اس کی اندرونی بیماریوں اور اس کے وساوس سے بھی خبردار ہے۔ اور بذریعہ اپنی وحی کے ان کا علاج کرتا ہے اور یہاں وسوسہ کو نفس کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسری جگہ شیطان کی طرف۔ ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴾ [الناس: 114:4-6] ''پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسہ کے شر سے۔ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے۔'' اور یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ وسوسہ پیدا کرنے میں شیطان کی تحریک بھی ہے اور وہ وسوسہ انسان کے اندر ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان سے اپنے قریب ہونے کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان گناہ پر جرأت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دور سمجھتا ہے۔

3138- ﴿شِمَالِ﴾ ﴿الْيَمِيْنِ﴾ کے مقابل پر ہے اور اس کی جمع شَمَائِلُ ہے۔ ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ﴾[النحل: 48:16] ''دائیں اور بائیں سے۔'' ﴿عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾[الأعراف: 17:7] ''ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔'' اس کے معنی زجاج نے کیے ہیں کہ میں انہیں اس بارہ میں گمراہ کروں گا جس سے وہ روکے گئے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں کہ میں اس میں ان کو گمراہ کروں گا جو وہ عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ انسان کمائے [كَسَبَتْ يَدَاكَ] کا مصداق ہوتا ہے گو دونوں ہاتھوں نے فی الواقع کچھ نہ کیا ہو۔ اور حدیث میں قرآن کے ذکر میں ہے: [وَ يُعْطٰى صَاحِبَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؛ فَقَالَ: يُعْطَى الْمُلْكَ بِيَمِينِهِ وَالْخُلْدَ بِشِمَالِهِ] (المجالسة وجواهر العلم، الجزء الخامس عشر، حديث: 2189) تو آپ کا اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ واقعی کوئی چیز اس کے دائیں بائیں ہاتھ میں پکڑا دی جائے گی۔ بلکہ یہ

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾

وہ کوئی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے۔ (3139)

منشا ہے کہ ملک اور خلد دونوں اسے دیئے جائیں گے۔ اور [طَيْرُ شِمَالٍ] اس پرند کو کہا جاتا ہے جس سے بدفال لی جائے اور [جَرِيَ لَهُ غُرَابَ شِمَالٍ] میں مراد ہے مَا يُكْرِهُ یعنی ایسی بات پیش آئی جسے وہ ناپسند کرتا تھا۔ اور اہل عرب کہتے ہیں [فُلَانٌ عِنْدِيْ بِالْيَمِيْنِ] جس سے مراد ہوتی ہے کہ وہ منزلہ حسنہ یا اچھے مرتبہ پر ہے۔ گویا يَمِيْنٌ کے معنی منزلہ حسنہ ہیں۔ اور جب ایک شخص کا مقام ذلیل ہو تو کہا جاتا ہے [اَنْتَ عِنْدِيْ بِالشِّمَالِ] اور شمال کے معنی شَوْمٌ یا نحوست بھی ہیں۔ اور [اِشْتَمَلَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ] کے معنی ہیں [اَحَاطَ بِهٖ] اس کا احاطہ کیا یا اسے شامل کیا۔ ﴿اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [الأنعام: 144:6] ''یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟''

﴿قَعِيْدٌ﴾ قَعُوْدٌ کے معنی تَرَصَّدُ بھی آتے ہیں یعنی کسی چیز کے انتظار میں ہونا یا اسے نگاہ میں رکھنا۔ ﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾﴾ [الأعراف: 16:7] ''میں ضرور تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔'' اور ﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المآئدة: 24:5] ''ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔'' میں معنی مُتَوَقِّعُوْنَ ہیں یعنی امید میں ہیں اور یہاں ﴿قَعِيْدٌ﴾ سے مراد ہے کہ وہ فرشتہ اسے نگاہ میں رکھتا ہے اور اس کے لیے اس کے خلاف لکھتا ہے۔ اور ﴿قَعِيْدٌ﴾ واحد اور جمع پر یکساں بولا جاتا ہے۔ (غ) اور مجاہد سے بھی ﴿قَعِيْدٌ﴾ کے معنی رَصَدٌ مروی ہیں۔ (ج)

اب اس حفاظت اعمال کا ذکر صراحت سے فرماتا ہے۔ دو لینے والے ہیں جو ہر فعل اور قول کو لے لیتے ہیں۔ یعنی وہ فرشتے جو ہر انسان کے ساتھ ہیں اور نیک و بد **اعمال کو محفوظ** کر لیتے ہیں اور ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ﴾ اور ﴿عَنِ الشِّمَالِ﴾ میں اشارہ منزلہ حسنہ اور گری ہوئی حالت کی طرف ہے جو علی الترتیب نیکی اور بدی سے پیدا ہوتی ہیں اور دوسری جگہ انہی لینے والوں کو کاتبین یا لکھنے والے کہا ہے۔ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ [الانفطار: 11:82-12] ''معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔'' مگر ان کا لکھنا اس طرح قلم و دوات سے نہیں نہ اس طرح کے کاغذوں پر ہے، جیسا کہ ہم انسان لکھتے ہیں۔ جیسا کہ روح المعانی میں بھی ہے [وَ كَذَا لَمْ يَصِحَّ خَبَرَ قَلْمَهُمَا وَ مِدَادَهُمَا]۔ پس ان کا لکھنا، ان کا کسی طرح پر محفوظ کر لینا ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ ہاں اس لکھنے یا حفاظت کے نتائج ہم بھی دیکھ لیتے ہیں اور پوری صفائی سے وہ قیامت میں نظر آئیں گے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور یہ بھی بعض آثار میں ہے کہ بھلائی لکھنے والا فرشتہ دوسرے پر امین یا امیر ہے۔

3139- ﴿يَلْفِظُ﴾ لَفْظٌ کسی چیز کا پھینکنا ہے جو تمہارے منہ میں ہو، اسی سے [لَفَظْتُ بِالْكَلَامِ] کے معنی ہیں کلام کیا۔ (ل) ﴿عَتِيْدٌ﴾ عَتَادٌ کسی چیز کا ذخیرہ کر رکھنا ہے قبل اس کے کہ اس کی حاجت ہو۔ جیسے اعداد یا تیار رکھنا اور عَتِيْدٌ تیار کرنے والا بھی ہے اور وہ چیز بھی جو تیار کی گئی ہو اور یہاں ﴿عَتِيْدٌ﴾ کے معنی اعمال عباد کو ذخیرہ رکھنے والا ہیں اور آگے آتا ہے: ﴿هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ﴾ اور ﴿اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾﴾ [النسآء: 18:4] ''جن کے لیے ہم نے دردناک دکھ تیار کر رکھا ہے۔'' میں

وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾

اور موت کی بیہوشی سچ مچ آ کر رہے گی، یہ وہ ہے جس سے تو کنارہ کرتا تھا۔ (3140)

وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾

اور صور میں پھونکا جائے گا یہ (عذاب کے) وعدے کا دن ہے۔

وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾

اور ہر شخص آئے گا اس کے ساتھ (ایک) چلانے والا اور (ایک) گواہ ہوگا۔ (3141)

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا، تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے ہٹا دیا۔ پس تیری نگاہ آج تیز ہے۔ (3142)

﴿اَعْتَدْنَا﴾ کو بعض نے اسی مادہ سے قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک اَعْدَدْنَا سے ہے۔ (غ)

3140- ﴿تَحِيْدُ﴾ حَادَ ایک چیز سے پھر گیا اس سے ہٹ کر دوسری طرف مائل ہوا یا بھاگ گیا۔ (ل)

3141- ﴿سَآئِقٌ﴾ سَوْقٌ چلانا، سَآئِقٌ چلانے والا اور مراد وہ فرشتہ ہے جو اسے چلائے۔ (غ) یا محشر کی طرف لے جائے۔ (ل) اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ سَآئِقٌ اللہ کی طرف چلانے والا اور ﴿شَهِيْدٌ﴾ اس کے عملوں کی گواہی دینے والا اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ سَآئِقٌ فرشتوں میں سے ہے اور شَهِيْدٌ اپنے نفس سے اس پر گواہی دینے والا یعنی جوارح۔ اور مجاہد سے ہے کہ سَآئِقٌ امر اللہ کی طرف لے جانے والا اور شَهِيْدٌ اعمال کی گواہی دینے والا۔ اور قتادہ سے ہے کہ سَآئِقٌ حساب کی طرف چلانے والا ہے۔ (ج) اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع ہے کہ ملک حسنات اور ملک سیئات میں سے ایک سَآئِقٌ ہے اور ایک شَهِيْدٌ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ سَآئِقٌ ملک الموت اور شَهِيْدٌ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو مسلم کا قول ہے کہ سَآئِقٌ شیطان ہے جو دنیا میں انسان کے ساتھ تھا۔ (ر) اور چونکہ یہاں ذکر دو فرشتوں کا ہے جو حسنات اور سیئات کو لکھتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ مراد سَآئِقٌ اور شَهِيْدٌ سے وہی ہیں اور بدیوں کے لکھنے والے کو سَآئِقٌ اس لیے کہا کہ بدیوں کے نتائج سامنے آنے پر انسان ان کی طرف خود قدم نہیں اٹھاتا۔ گویا مجبور کر کے اس کی طرف لے جاتا ہے۔ جس طرح ایک چار پائے کو لے جایا جاتا ہے۔ اور نیکیوں کے لکھنے والا چونکہ انسان کے اعمال حسنہ کی گواہی دیتا ہے اس لیے اسے شَهِيْدٌ کہا۔

3142- ﴿غِطَآءَكَ﴾ غِطَآءٌ وہ چیز ہے جو کسی چیز کے اوپر ڈالی جائے از قسم طبق وغیرہ جیسا کہ غِشَآءٌ وہ ہے جو از قسم لباس دوسری کے اوپر ڈالی جائے اور جہالت کے لیے استعارۃً استعمال ہوا ہے۔ (غ)

وَ قَالَ قَرِیْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ ﴿۲۳﴾

اور اس کا ساتھی کہے گا یہ وہ ہے جو میرے پاس تھا (جہنم کے لیے) تیار۔ (3143)

اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۲۴﴾

ہر ناشکرے دشمن (حق) کو دوزخ میں ڈال دو۔ (3144)

مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبِ ﴿۲۵﴾

نیکی سے روکنے والے، حد سے بڑھنے والے، شک کرنے والے کو۔

الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ ﴿۲۶﴾

جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہراتا تھا۔ سو اسے سخت عذاب میں ڈال دو۔

بدی کے بدنتائج کو انسان یہاں کیوں نہیں دیکھتا: ﴿مِنْ هٰذَا﴾ میں اشارہ بدی کے بدنتائج کی طرف ہے جن پر لفظ ﴿سَآئِقٌ﴾ دلالت کرتا ہے۔ یعنی جب وہ نتائج سامنے آئیں گے تو اس وقت وہ شخص گویا اس قول کا مصداق ہوگا۔ اور ﴿غِطَآءَكَ﴾ کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ نتائج بد تو یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر انسان کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے اور لذات دنیا میں انہماک کی وجہ سے وہ انہیں نہیں دیکھتا۔ تو قیامت میں صرف وہ ﴿غِطَآءَكَ﴾ دور کر دیا جاتا ہے جو یہاں پڑا ہوا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بدنتائج تو پہلے بھی اسی طرح موجود تھے مگر انسان انہیں دیکھتا نہ تھا اور قیامت کے دن ان چیزوں کو اس لیے دیکھ لے گا کہ اس کی نظر تیز ہو جائے گی یا اس کو نئے حواس مل جائیں گے، جن سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ان لطیف امور کو بھی دیکھ لے جو ان حواس سے مخفی ہیں۔ اور بعض نے ﴿مِّنْ هٰذَا﴾ سے مراد امور معاد وغیرہ کو لے کر یہ معنی کیے ہیں کہ وحی الٰہی سے ہم نے وہ غفلت کا پردہ دور کر دیا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ امور نظر نہ آتے تھے۔ (ر) اور اس میں شک نہیں کہ قیامت کبریٰ کے ساتھ ساتھ اس قیامت روحانی کا ذکر بھی چلتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے وجود سے دنیا میں قائم ہوئی۔

3143- ﴿قَرِیْنُهٗ﴾ قَرِیْنٌ سے مراد شیطان قرین ہے ﴿وَ قَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ﴾ [حٰمٓ السجدة: 25:41] یعنی جب بدی کے بدنتائج سامنے آئیں گے تو شیطان جو اس بدی کا محرک تھا وہ بھی آئے گا کہ یہ میری تحریک سے تیار ہوا ہے جو جہنم میں ڈالا جانے کے لائق ہے۔

3144- ﴿اَلْقِیَا﴾ میں ہو سکتا ہے کہ خطاب سائق اور شہید کی طرف ہو اور دونوں کو خطاب اس لیے کیا کہ بدی کی وجہ سے اسے جہنم میں ڈالا جاتا ہے اور نیکی اس کی اس قدر کم تھی کہ وہ بدی کے بدنتائج کو دور نہ کر سکی۔ مگر مفسرین نے اور توجیہات بھی کی ہیں۔ ایک یہ کہ ﴿اَلْقِیَا﴾ کا الف نون تاکید کی جگہ ہے اور حسن کی قراءت اَلْقِیَنْ نون خفیفہ سے اسی معنی کی مؤید ہے۔ (ر) اور دوسری یہ

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَ لٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾

اس کا ساتھی کہے گا اے ہمارے ربّ! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں دور نکل گیا تھا۔ (3145)

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾

کہے گا میرے سامنے مت جھگڑو اور میں نے (عذاب کا) وعدہ تمہاری طرف پہلے بھیج دیا تھا۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ ع 2 14 16

میرے حضور بات بدلی نہیں جاتی اور نہ میں بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا ہوں۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾

جس دن ہم دوزخ کو کہیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔ (3146)

کہ اہل عرب اکیلے اور جماعت کو حکم دینے میں تاکید کے لیے **تثنیہ کو استعمال کرتے ہیں** اس پر ابن جریر نے کئی شعر نقل کیے ہیں۔ مثلاً [فقُلْتُ لِصَاحِبِيْ لَا تَحْبِسَانَا ...] یا [فَإِنْ تَزْجُرَانِيْ يَا ابْنَ عَفَّانَ أَزْدَجِرْ] اور بعض نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ تثنیہ فعل کے دہرائے جانے کے قائم مقام ہوتا ہے یعنی أَلْقِ أَلْقِ کی جگہ ﴿اَلْقِيَا﴾ کہہ دیا۔ اور فعل کا دہرانا تاکید کے لیے ہے اور [الملك: 4:67] میں ﴿كَرَّتَيْنِ﴾ سے مراد کثرت ہے۔

3145- گویا شیطان اپنی بریت ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اسے گمراہ نہیں کیا یہ خود ہی گمراہی میں مبتلا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے۔ ﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ﴾ یعنی میرے حضور جھگڑا نہ کرو۔ دونوں کو بدی پر عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا۔ کفار اور ان کے شیاطین کا یہ جھگڑا قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے۔ ﴿مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ [إبراهيم: 22:14] ''اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات مان لی، سو مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔''

3146- ﴿امْتَلَاْتِ﴾ [مَلَأَ الشَّيْءُ] ایک چیز کو بھر دیا اور اِمْتَلَاءٌ وہ بھر گئی۔

﴿مَّزِيْدٍ﴾ زِيَادَةٌ پر [دیکھو نمبر: 1390] اور ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ میں زیادہ کے لیے استدعا بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ بھر چکی ہے۔ جیسا فرمایا: ﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾﴾ [هود: 119:11] ''دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔'' (غ)

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾ اور بہشت متقیوں کے لیے قریب کر دی گئی ہے، کچھ دور نہیں۔ (3147)

اللہ کے دوزخ میں وضع قدم سے مراد:

قُوْلُ کے لیے [دیکھو نمبر: 45] کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اس پر بھی قول کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ [اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطِّنِيْ] بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ہے [قَالَ: يُلْقَى فِي النَّارِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ. حَتَّى يَضَعَ قَدَمَهُ فَتَقُولُ قَطِ قَطِ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب: وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ، حديث: 4848) یعنی لوگ آگ میں ڈالے جائیں گے اور دوزخ کہے گی کچھ اور بھی ہے یہاں تک کہ وہ اپنا قدم اس میں رکھے گا۔ پس وہ کہے گی بس بس۔ اسی کی مثل اور روایات بھی ہیں۔ وہ امور جو عالم آخرت سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق ظاہر الفاظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے قدم سے مراد سچ مچ کا قدم ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تشبیہات سے پاک ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: 11:42] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' نہایہ اور لسان العرب میں [حَتَّى يَضَعَ اللّٰهُ فِيهَا قَدَمَهُ] الفاظ کی تشریح میں ہے کہ حسن اور ان کے اصحاب سے روایت ہے کہ اس سے مراد ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں ان لوگوں کو ڈالے گا جنہیں اپنی بدترین مخلوقات میں سے اس نے آگ کے لیے پہلے سے بھیج رکھا ہے۔ [اَلَّذِيْنَ قَدَّمَهُمْ لَهَا مِنْ شَرَارِ خَلْقِهٖ] تو وہ اللہ کا قدم آگ کے لیے ہیں۔ [فَهُمْ قَدَمَ اللّٰهُ لِلنَّارِ] جیسا کہ مسلم اس کا قدم جنت کے لیے ہیں اور قَدَمٌ ہر ایک وہ چیز ہے جسے تم خیر یا شر کے لیے آگے بھیجو۔ اور کہا گیا ہے کہ کسی چیز پر قدم کا رکھنا مثال ہے۔ رَدْعٌ اور قَمْعٌ کے لیے یعنی باز رکھنے اور ذلیل کرنے کے لیے۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ کا امر اس کے لیے آئے گا تو اسے اور زیادہ کے طلب سے روک دے گا۔ اور اس کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد اس کے جوش کا ٹھنڈا کرنا ہے۔ جیسا کہ کسی امر کے لیے جس کے تم ابطال کا ارادہ کرو۔ کہا جاتا ہے [وَضَعْتُهُ تَحْتَ قَدَمِيْ] (ن۔ل) اور بعض نے قدم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وعدہ لیا ہے جو وہ پہلے سے کر چکا ہے۔ [سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ] (غق) اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام اسی طرح صورت حال کا اظہار ہے جس طرح ﴿فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ [حٰمٓ السجدة: 11:41] ''سو اسے اور زمین کو کہا، آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔'' جس سے مراد صرف زمین اور آسمان کی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اظہار ہے۔ نہ یہ کہ وہ لفظ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو کہے تھے اور انہوں نے وہ جواب دیا تھا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ دوزخ تو **هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا ہی نعرہ لگاتی ہے** اگر کوئی چیز اس کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ جس طرح انسان کی حرص ہر وقت ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کا نعرہ لگاتی ہے وہی مثال دوزخ کی ہے۔ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾﴾ [النبأ: 26:78] ''بدلہ موافق (اعمال ہے)۔'' یہ دونوں نعرے زبان حال سے ہی ہیں۔

3147- یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بہشت قیامت کے دن متقیوں کے لیے قریب کر دی جائے گی۔ لیکن قریب کرنے کا ذکر اس دنیا کے

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾

یہ وہ ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے ہر (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والے، حفاظت کرنے والے کے لیے۔ (3148)

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿۳۳﴾

جو غیب میں رحمٰن سے ڈرتا ہے اور رجوع کرنے والے دل کے ساتھ آتا ہے۔

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾

سلامتی سے اس میں داخل ہو جاؤ، یہ رہنے کا دن ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

ان کے لیے اس میں ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ اور ہمارے پاس (اس سے) بڑھ کر ہے۔ (3149)

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾

اور کتنی نسلیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیں جو قوت میں ان سے سخت تر تھیں۔ سو انہوں نے شہروں کو چھان مارا کیا کوئی بھاگنے کی جگہ ہے۔ (3150)

لیے زیادہ موزوں ہے۔ یعنی متقی کے لیے اسی جگہ جنت قریب کر دی جاتی ہے گویا جس قدر وہ تقویٰ میں قدم بڑھاتا ہے اسی قدر جنت اس سے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے ﴿غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ ساتھ بڑھایا کہ دور نہیں۔ جیسا کہ خیال ہے کہ قیامت میں ہی جا کر ملے گی۔ اور دوسری جگہ ہے: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ [الأعراف: 56:7] ''اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔''

3148- ﴿حَفِيْظٌ﴾ [دیکھو نمبر: 700] یہاں مراد ہے احکام الٰہی یا حدود اللہ کی حفاظت کرنے والا یا ان کی نگہداشت کرنے والا۔

3149- یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ انسان جو چاہے اسے مل جائے۔ ﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا﴾ مگر ﴿وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ میں بتایا کہ ہم اسے وہ کچھ بھی دیں گے جو اس کے اپنے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جیسے زِيَادَةٌ کو۔ [دیکھو نمبر: 1390]

3150- ﴿فَنَقَّبُوْا﴾ نَقَبَ دیوار اور چمڑے میں سوراخ کرنا ہے۔ اور [نَقَبُ الْقَوْمُ] کے معنی ہیں سَارُوْا وہ چلے گئے اور نَقِيْبٌ وہ ہے جو قوم کے حالات کا پتہ لگاتا ہے۔ اس کی جمع نُقَبَاءٌ ہے۔ ﴿وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾ [المآئدة: 12:5] ''اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔'' (غ) ﴿هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ علیحدہ کلام ہے یعنی ہم نے پہلوں کو ہلاک کر دیا تو کیا ان

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾	اس میں اس کے لیے نصیحت ہے جس کا دل ہے یا وہ کان لگا تا ہے۔ درآنحالیکہ (اس کا دل) حاضر ہے۔(3151)
وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ اور تکان نے ہمیں نہیں چھوا۔(3152)
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾	سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر، سورج نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے۔
وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾	اور رات کے حصے میں بھی اس کی تسبیح کر اور نماز کے پیچھے بھی۔(3153)
وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾	اور سن! جس دن پکارنے والا نزدیک جگہ سے پکارے۔
يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾	جس دن وہ چیخ کو حق کے ساتھ سن لیں گے، یہ نکل پڑنے کا دن ہے۔(3154)

کے لیے کوئی بھاگ کر چلا جانے کی جگہ ہے۔

3151- ﴿لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ [دیکھو نمبر: 1409] ظاہر ہے کہ یہاں مراد عقل و علم ہی ہے ورنہ دل تو ہر ایک کا موجود ہی ہے اور ﴿هُوَ شَهِيْدٌ﴾ میں بھی حضورِ قلب ہی مراد ہے جس کا دل حاضر نہیں وہ گویا وہاں موجود ہی نہیں۔

3152- چھ دن میں بنانے سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ تھک گیا تھا، بلکہ بتدریج سے بنانے میں حکمت تھی۔ اسی لیے فرمایا کہ حق اور صداقت کی ترقی بھی بتدریج ہوگی ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾۔

3153- ﴿اَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ میں سجود سے مراد نماز ہے اور **نماز کے بعد تسبیح سے مراد نوافل** بھی ہو سکتے ہیں اور ذکر بھی۔ (ج)

3154- **منادی** کے پکارنے سے مراد عموماً قیامت کے دن اسرافیل یا جبریل کا پکارنا لیا گیا ہے۔ اور ﴿مَّكَانٍ قَرِيْبٍ﴾ سے مراد بیت

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ﴿۴۳﴾

ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی انجام کار آنا ہے۔

یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ﴿۴۴﴾

جس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی (وہ) تیزی سے (نکل پڑیں گے)، یہ جمع کرنا ہم پر آسان ہے۔ (3155)

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ﴿۴۵﴾ ع 3 16 17

ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور تو ان پر جبر کرنے والا نہیں۔ سو قرآن کے ساتھ اسے نصیحت کر جو میرے وعدۂ (عذاب سے) ڈرتا ہے۔ (3156)

المقدس۔ مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف منادی آنحضرت ﷺ کو کہا ہے۔ ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ [آل عمران: 193:3] ''ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لیے بلاتا ہے۔'' اور یہی ﴿یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ﴾ ہے۔ گویا مضمون کا انتقال قیامت کبریٰ سے قیامت روحانی کی طرف کیا ہے۔ اور ﴿مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ﴾ میں اشارہ ان کے قبول کر لینے کی طرف ہے۔ جس طرح ﴿وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ﴾ [السبأ: 51:34] ''اور نزدیک مکان سے پکڑے جائیں گے۔'' میں اسی دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ [دیکھو نمبر: 2705] اور ﴿یَوْمُ الْخُرُوْجِ﴾ سے مراد روحانی طور پر اٹھ کھڑا ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2585]

3155- اگر یہاں اشارہ قیامت کبریٰ کی طرف لیا جائے تو زمین کے پھٹنے کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہاں مجازاً مراد ان کا روحانی قبروں سے نکلنا ہی ہو۔ ﴿سِرَاعًا﴾ مصدر ہے جو ﴿عَنْهُمْ﴾ میں ضمیر سے حال ہے۔

3156- ﴿قٓ ۟ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۚ﴾ سے سورت کو شروع کیا تھا اور ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ پر ختم کیا۔ پس اصل مضمون اس کا قرآن مجید کے ذریعہ سے انقلاب عظیم پیدا ہونا ہے۔ ﴿جَبَّارٍ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 807]۔

اٰيَاتُهَا 60 (51) سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ (67) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾	گواہ ہیں اُڑا کر پھیلا دینے والیاں۔
فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾	پھر بوجھ اٹھانے والیاں۔
فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾	پھر نرمی سے چلنے والیاں۔
فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾	پھر کام کو تقسیم کرنے والیاں۔ (3157)

سورۃ الذاریات

نام:

اس سورت کا نام اَلذّٰرِيٰتِ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 60 آیتیں ہیں۔ ذارِیَاتِ وہ ہوائیں ہیں جو اڑا کر پھیلانے کا کام کرتی ہیں۔ یعنی بیج کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ پہنچاتی ہیں۔ اور یہاں حق کے پھیلانے والی جماعت کے ساتھ انہیں مشابہت دی ہے اور بتایا ہے کہ پہلی حالت حق کی بھی ایسی ہی ہوتی ہے، مگر آخر وہ بڑھتا اور پھیلتا ہے اور کوئی مخالفت اسے روک نہیں سکتی۔ بلکہ اس کی مخالفت کرنے والے خود تباہ ہو جاتے ہیں۔ پچھلی سورت میں ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ حق کو غالب کرے، تو یہاں بتایا ہے وہ غلبہ تدریجی ہوتا ہے اور یہ بیج پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ آخر بارآور ہو کر تمام دنیا میں پہنچے گا۔ سورت مکی ہے اور اس کا نزول ابتدائی مکی زمانہ کا ہی معلوم ہوتا ہے۔

3157- **حق کی کامیابی پر مناظر قدرت سے دلیل:** سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایسے ہی الفاظ مرفوع ہیں کہ ﴿الذّٰرِيٰتِ﴾ سے مراد ہوائیں ہیں اور ﴿فَالْحٰمِلٰتِ﴾ سے مراد بادل اور ﴿فَالْجٰرِيٰتِ﴾ سے مراد کشتیاں ہیں اور ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور ہوائیں جو کام کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ بیج کو ایک جگہ سے اُڑا کر دوسری جگہ پہنچاتی ہیں یا نباتات اور درختوں میں نر اور مادہ کو ملاتی ہیں۔ جیسا کہ آج تحقیقات علمی سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، اور یہ قرآن کریم کی صداقت اور رسول اللہ ﷺ کی سچائی کا ایک بین ثبوت ہے کہ ایسی علمی باریکیاں جن کا دنیا کو صدہا سال بعد علم ہوا عرب کے ایک امی کی زبان سے ظاہر ہوئیں۔ اور ﴿الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴾ کے بعد دوسرا مرتبہ ﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴾ کا بیان فرمایا

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے۔

وَّ اِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ اور جزا و سزا ضرور آ کر رہے گی۔

ہے۔ گویا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ہواؤں کا اس چیز کو پھیلانا ہے جسے سائنس والے پولن کہتے ہیں، ایک حمل کے قائم مقام ہوتا ہے اور ﴿فَالْحٰمِلٰتِ﴾ کی تفسیر میں جو اوپر بادل بیان ہوا ہے تو وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ بادلوں کا کام یہ ہے کہ وہ بوجھ کو اٹھاتے ہیں یعنی پانی کو سمندروں سے اٹھا کر لاتے ہیں اور پھر جگہ جگہ پانی برس کر وہ بیج جن کو ہواؤں نے پھیلایا تھا، اُگتے اور پھولتے اور پھلتے ہیں۔ تب اس پیداوار کو اور اس سے جو اور سامان پیدا ہوتے ہیں کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں۔ پھر فرشتے حکم الٰہی کے مطابق اس کی مخلوق میں تقسیم امر کا کام کرتے ہیں۔ تو گویا ان چاروں باتوں میں مناظر قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ایک چیز ادنیٰ منازل سے ترقی کر کے اعلیٰ مقامات تک پہنچتی ہے اور یوں ان ظاہری نظارہ ہائے قدرت کو حق کی ترقی اور کامیابی کے قانون پر بطور گواہ پیش کیا ہے۔ اور ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵﴾ میں انہی وعدوں کی طرف اشارہ ہے جو حق کی آخری کامیابی اور اس کی مخالفت کی آخری ناکامی کے متعلق دیئے گئے تھے۔ گویا بتایا ہے کہ جس طرح ظاہری منظر قدرت میں کچھ اسباب کام کر رہے ہیں، اسی طرح حق کی ترقی میں بھی کچھ اسباب کام کر رہے ہیں۔ جس طرح وہاں ہوائیں بیج کو اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں، اسی طرح حق کے قائم ہونے میں پہلی منزل یہی تھی کہ کچھ لوگ اس حق کے بیج کو تمام ممالک میں پہنچا دیں۔ چنانچہ عرب کے کناروں سے لوگ آتے تھے اور اس حق کو جو رسول اللہ ﷺ لائے بغیر قبول کیے عرب کے کناروں تک لے جاتے تھے۔ دوسرا مرتبہ ان ہواؤں کا ہے جو اس بیج میں زندگی پیدا کرتی اور درختوں اور نباتات کو بارآور کرتی ہیں اور یہ بارش کی ہوائیں ہیں۔ چنانچہ اسی طرح اس بیج پر جو جگہ جگہ پھیل گیا تھا جب رحمت الٰہی کی بارش ہوئی تو وہ لامعلوم بیج جگہ جگہ پرورش پا کر ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ﴾ [الفتح: 29:48] ''کھیتی کی طرح، جس نے اپنی سوئی نکالی۔'' کا مصداق ہوا اور لوگوں نے حق کو قبول کیا۔ پھر جماعتوں کی جماعتیں اس حق کو لے کر باہر پہنچیں اور یہ ﴿فَالْجٰرِيٰتِ﴾ کے قائم مقام ہوگئیں۔ گویا جو وحی اللہ تعالیٰ نے ملک عرب میں نازل کی تھی اس کی پیداوار کو لے کر ملک عرب کے لوگ باہر چلے گئے تا اس بارش کے پھلوں سے دوسروں کو بھی متمتع کریں اور یوں اسے دنیا میں تقسیم کر کے ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴﴾ کا مصداق ہوئے اور ہر ملک کے لوگوں میں اسے پہنچا دیا اور جو اس کا اہل تھا اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اور چاروں لفظ ہواؤں پر بھی صادق آ سکتے ہیں۔ یعنی ﴿الذّٰرِيٰتِ﴾ وہ ہوائیں ہیں جو سمندروں سے بخارات کو اڑاتی ہیں اور ﴿فَالْحٰمِلٰتِ﴾ وہ جو اس پانی کے بوجھ کو اٹھاتی ہیں اور ﴿فَالْجٰرِيٰتِ﴾ وہ جو اسے لے کر چلتی ہیں اور ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ﴾ وہ جو اسے جگہ جگہ برساتی ہیں اور اس سورت میں بھی وحی الٰہی کی اس بارش کی طرف ہی اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا پر برسائی گئی۔ گویا ایک پیاسی اور تڑپتی ہوئی دنیا سے بخارات بن کر اوپر اٹھے اور وحی الٰہی کے رنگ میں پھر دنیا پر بارش ہو کر دنیا کی زندگی کا موجب ہوئے اور بادلوں کو ﴿فَالْحٰمِلٰتِ﴾ اور فرشتوں کو ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ﴾ بلحاظ جماعتوں کے فرمایا ہے اور اسی لحاظ

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ﴿۷﴾ رستوں والا آسمان گواہ ہے۔ (3158)

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ﴿۸﴾ تم صرف مختلف باتیں کہہ رہے ہو۔

يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ؕ﴿۹﴾ اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو حق سے باطل کی طرف پھرتا ہے۔ (3159)

سے مومنوں کی جماعتیں بھی ان الفاظ سے مراد ہوسکتی ہیں۔یعنی ایک جماعتیں وہ ہوں گی جو حق کے بیج کو دور دور پہنچائیں گی، پھر ایسی جماعتیں ہوں گی جو اس بیج کو بطور حمل اپنے اندر لے لیں گی، پھر ایسی جماعتیں ہوں گی جو اسے لے کر آسانی سے چلنے والی ہوں گی۔یعنی وہ اسے کوئی بوجھ محسوس نہ کریں گی، بلکہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں یسر ہوگا پھر وہی لوگ اس حق کو لے کر دوسرے انسانوں تک پہنچائیں گے اور یہ ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ﴾ ہیں۔

3158- ﴿الْحُبُكِ﴾ واحد اس کا حَبِيْكَةٌ ہے اور حَبْك کے معنی باندھنا اور حُبُك کے معنی رستے ہیں [حُبُكَ السَّمَآءِ طَرَائِقُهَا] اور مراد اس سے نجوم کے رستے ہیں۔(ل) اور بعض لوگوں نے اس سے مراد مخصوص رستے لیے ہیں جو ستاروں اور کہکشاں کے ہیں اور بعض نے معقول رستے مراد لیے ہیں جو بصیرت سے معلوم ہوتے ہیں، جس کی طرف ﴿يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا ...الآية﴾ [آل عمران: 191:3] ''اللہ کو کھڑے یاد کرتے ہیں۔'' میں اشارہ ہے۔(غ)

آسمان میں راستے اور صداقت وحی کی ایک دلیل:

اللہ تعالیٰ کا آسمان کو ﴿ذَاتِ الْحُبُكِ﴾ فرمانا اسی کے مطابق ہے جو فرمایا ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [يٰسٓ: 40:36] ''سب (اپنے اپنے) دائرے میں چل رہے ہیں۔'' یعنی ان رستوں سے مراد اجرام سماوی کے رستے ہیں اور یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے اس لیے کہ یہ اس وقت کے لفظ ہیں جب دنیا میں کسی سائنس دان کو اس بات کا وہم بھی نہ تھا کہ اجرام سماوی ستاروں کے گرد گھومتے ہیں یا خود ستارے جیسے ہمارا سورج بھی کسی رستے پر چل رہے ہیں۔ اور یہاں رستوں والے آسمان کو بطور گواہ پیش کرنا اس لحاظ سے ہے کہ یہ اجرام سماوی ایک قانون کے ماتحت ہونے اور ایک نظام میں منسلک ہونے سے یہ شہادت دے رہے ہیں کہ وہ حق ہے جو پیغمبر کہتا ہے۔یعنی اس کارخانے کا چلانے والا ایک ہی ہے اور اس کے مقابل جو کچھ تم لوگ اس کی وحی کے متعلق رائیں لگاتے ہو وہ خود اپنے اندر اختلاف سے ہی اپنے باطل ہونے پر دلیل ہیں۔حق ایک ہی ہے اور ایک ہی سرچشمہ سے نکلتا ہے اور باطل باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اس لیے جواب قسم ﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ ہے۔

3159- ﴿اُفِكَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 986] جو شخص حق سے باطل کی طرف پھرتا ہے وہی اس قرآن سے منہ موڑتا ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾	اٹکلیں دوڑانے والے مارے گئے۔
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾	جو جہالت میں بھولے ہوئے ہیں۔ (3160)
يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾	پوچھتے ہیں جزاوسزا کا دن کب آئے گا۔ (3161)
يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾	جس دن وہ آگ میں جلائے جائیں گے۔
ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾	اپنے دکھ دینے کا مزہ چکھو۔ یہ وہ ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۵﴾	متقی باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔
اٰخِذِيْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶﴾ ؕ	لے رہے ہوں گے جو ان کو اُن کے رب نے دیا۔ وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔
كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾	تھوڑا سا جو وہ رات کو سوتے تھے۔ (3162)
وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾	اور صبح کے وقتوں میں وہ استغفار کرتے تھے۔

3160- ﴿سَاهُوْنَ﴾ سَهْوٌ خطا ہے جو غفلت سے ہو۔ (غ) اور نہایہ میں ہے کہ [اَلسَّهْوَ فِي الشَّيْءِ] علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ترک کرنا ہے اور [اَلسَّهْوَ مِنَ الشَّيْءِ] باوجود علم کے اس کا ترک کرنا ہے، اسی معنی میں ہے ﴿هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ [الماعون: 5:107] ''اپنی نماز سے غافل ہیں۔'' (ل) یعنی باوجود نماز پڑھنے کے نماز سے بے خبر ہیں، یعنی اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

3161- ﴿اَيَّانَ﴾ کے معنی مَتٰی کے قریب قریب ہیں یعنی کب۔ ﴿اَيَّانَ مُرْسٰهَا﴾ [النازعات: 42:79] ''کب اس کا قائم ہونا ہے۔'' اور یہ [اَیّ اَوْ اِنَّ] سے ہے اور اِیَّا ضمیر منصوب سے ملایا جاتا ہے جیسے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اور اِیْ تحقیق کلام کے لیے آتا ہے۔ ﴿قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ﴾ [یونس: 53:10] ''کہہ ہاں میرے رب کی قسم!'' (غ)

3162- ﴿يَهْجَعُوْنَ﴾ هَجُوْعٌ رات کے سونے کو کہتے ہیں۔ (غ)

وَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾

اوران کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق تھا۔ (3163)

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾

اورزمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشان ہیں۔

وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اورتمہاری اپنی جانوں میں بھی۔تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾

اورتمہارا رزق آسمان میں ہے اور وہ بھی جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ (3164)

فَوَ رَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَاۤ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾ ع 1 23 18

سوآسمان اورزمین کارب گواہ ہے کہ یہ یقیناً سچ ہے۔ٹھیک اسی طرح جوتم باتیں کرتے ہو۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ وقف لازم

کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟

3163- ﴿الْمَحْرُوْمِ﴾ وہ ہے جو خیر سے روکا گیا ہے اور یہاں مَحْرُوْمٌ کے معنی ایسا شخص بھی کیے گئے ہیں جس کا مال بڑھتا نہیں [لَا يَنْمٰى لَهٗ مَالٌ] اور کہا گیا ہے کہ وہ بے روزگار شخص ہے جو کچھ کما نہیں سکتا۔ (ل) اور ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ [القلم: 27:68] ''بلکہ ہم بے نصیب ہیں۔'' میں مراد ہے کوشش کی جانب سے خالی ہاتھ رہے ہوئے۔اور یہاں مَحْرُوْمِ سے مراد ہے جس کا رزق وسیع نہیں جس طرح اوروں کا ہے۔اور جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد کتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتے کا نام ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا ہے۔اور یہ اس کی طرف سے مثال کے طور پر ہے۔کیونکہ کتے کو لوگ بہت محروم کرتے یا روکتے ہیں۔(غ) اور رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ مَحْرُوْمٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور جس کی حاجت کا علم نہیں ہوتا کہ اسے کوئی خیرات دے یعنی وہ جو مانگتا نہیں اور تعفف اختیار کرتا ہے۔(ج)

3164- ﴿فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ﴾ مجاہد سے ہے کہ رزق سے مراد یہاں مَطَرٌ یعنی بارش ہے۔(ج) تو مطلب یہ ہوا کہ پانی جو تمہارے لیے مایۂ حیات ہے وہ آسمان سے ہی اترتا ہے اور سَمَآءٌ کے معنی سحاب یعنی بادل بھی لیے گئے ہیں۔(ر) تو مطلب یہ ہوا کہ بارش سے تمہیں رزق ملتا ہے۔اگر آسمانی بارش بند ہو جائے تو تمہارے کھانے پینے کے سامان بھی نہ رہیں اور اس صورت میں ﴿مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ کا منشا یہ ہوگا کہ وہ جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے بارش کی طرح اوپر سے ہی آتا اور تمہارے لیے مایۂ حیات بنتا ہے۔یا یہ کہ وہ بھی روحانی بارش سے ہی تعلق رکھتا ہے۔اور یا ﴿فِي السَّمَآءِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ اٹل ہے اور ایسا ہی ﴿مَا تُوْعَدُوْنَ﴾ بھی اٹل ہے۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

جب اس پر داخل ہوئے، کہا سلام۔ اس نے (جواب میں) کہا سلام۔ (یہ) اجنبی لوگ ہیں۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ۙ

پس وہ اپنے گھر والوں کی طرف چپکے سے گیا اور ایک موٹا بچھڑا لایا۔ (3165)

فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ۙ

سو اسے ان کے نزدیک کیا۔ کہا، کیا تم کھاتے نہیں!

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

پس دل میں ان سے ڈرا۔ انہوں نے کہا ڈر نہیں اور اسے ایک صاحب علم لڑکے کی خوش خبری دی۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِىْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾

تو اس کی عورت چیخ مار کر آگے آئی اور اپنے منہ پر ہاتھ مارا اور کہا بڑھیا بانجھ (ہوں)۔ (3166)

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

انہوں نے کہا، اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے۔ وہ حکمت والا، علم والا ہے۔

3165- دوسری جگہ ہے ﴿بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ﴾ [هود: 69:11] یعنی بھنا ہوا۔ ان مہمانوں کے لیے [دیکھو نمبر: 1480] آیت: 31 میں انہیں مرسل کہا ہے۔

3166- ﴿صَرَّةٍ﴾ صَرَّ [دیکھو نمبر: 504] اور ﴿صَرَّةٍ﴾ جماعت کو بھی کہتے ہیں جس کے بعض بعض سے منضم ہوں۔ [كَأَنَّهُمْ صُرُّوْا] گویا کہ وہ ایک برتن میں جمع کیے گئے ہیں۔ اور صَرَّةٍ۔ صَيحَةٌ چیخ کو بھی کہتے ہیں۔ (غ) اور کرب اور جنگ کی شدت کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) ﴿فَصَكَّتْ﴾ صَكّ کے معنی مارنا ہیں خواہ کسی چیز سے ہوں۔ (ل) بخاری میں اس کی تفسیر میں [فَجَمَعَتْ أَصَابِعَهَا فَضَرَبَتْ جَبْهَتَهَا] یعنی اپنی انگلیاں اکٹھی کیں اور اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ دوسری جگہ بیان کیا ہے کہ یہ صرف تعجب سے تھا۔ ﴿يٰوَيْلَتٰى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾﴾ [هود: 72:11] ''مجھ پر تعجب! میں جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''